دوسرا کنارا

(منتخب ڈرامے)

غلام جیلانی

۱۔ ایکویریم ۹
۲۔ چوتھا محور ۲۷
۳۔ طوفان کے بعد ۴۷
۴۔ دوسرا کنارا ۷۵
۵۔ چٹان ۹۵
۶۔ یگ یگ کی پیاس ۱۲۵
۷۔ سائے کی موت ۱۳۵
۸۔ زندگی کے کنارے ۱۵۵

طبع : اول
تعداد : پانچ سو
طباعت : ادم سائی گرافکس، نارائن گوڑہ 528 - 4 - 3 حیدرآباد (29)
تاریخ اشاعت : دسمبر ۱۹۹۰ء
خوشنویس : سید عبدالحمید
آرٹ : سعادت علی خاں
ناشر : مصنف
قیمت : (۴۵) روپے

اعانت : اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش۔ حیدرآباد۔
اہتمام : ادارۂ شعر و حکمت۔ حیدرآباد۔
ملنے کے پتے :-
(۱) سیل کاونٹر۔ روزنامہ سیاست، جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد۔
(۲) سب رس، کتاب گھر، ایوانِ اُردو۔ پنجہ گٹہ روڈ۔ حیدرآباد (۴۸۲)
(۳) کتب خانہ انجمنِ ترقی اُردو، آندھرا پردیش۔ اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد
(۴) اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش، اے۔ سی۔ گارڈ، حیدرآباد۔
(۵) بزمِ ربانی، 195/3 RT وجئے نگر کالونی۔ حیدرآباد (۴۵۷)

میں نے زندگی میں جو بھی پایا ہے، اپنی والدہ اور والد غلام ربانی صاحب (مرحوم) کی تربیت اور شفقت کا فیض ہے۔

وہ ساری عمر دوست کی طرح میرے ساتھ رہے۔ آج بھی ہیں اور تادمِ آخر رہیں گے۔

میرا آبائی وطن دِلّی کے قریب پَل وَل ہے۔ ۱۹۲۶ء میں وہیں پیدا ہوا۔ مگر بچپن ہی سے حیدرآباد میں رہا جہاں والد جناب غلام ربانی صاحب (اردو زبان وادب کے ممتاز محقق اور ماہر آثار قدیمہ) ملازمت کے سلسلے میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ یہیں تعلیم مکمل کی اور عثمانیہ یونیورسٹی سے فزکس میں ام۔ایس سی کرکے وہیں لکچرر مقرر ہوگیا۔ ۱۹۸۶ء میں بہ حیثیت ریڈر فزکس ریٹائر ہوا۔

'دوسرا کنارا' میرے منتخب ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے لکھنے کا شغل ساری عمر جاری رہا مگر کتابی شکل دینے کا خیال اب آیا ہے 'دیر آئد درست آئد' والی بات اس پر صادق آتی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ تو آپ کریں گے۔

غلام جیلانی

میں نے زندگی میں جو بھی پایا ہے، اپنی والدہ
اور والد غلام ربانی صاحب (مرحوم) کی تربیت
اور شفقت کا فیض ہے۔
وہ ساری عمر دوست کی طرح میرے ساتھ
رہے۔ آج بھی ہیں اور تادمِ آخر رہیں گے۔

میرا آبائی وطن دِلّی کے قریب پَل وَل ہے۔ ۱۹۲۶ء میں وہیں
پیدا ہوا۔ مگر بچپن ہی سے حیدرآباد میں رہا جہاں والد جناب غلام ربانی صاحب
(اردو زبان و ادب کے ممتاز محقق اور ماہر آثارِ قدیمہ) ملازمت کے سلسلے میں
سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ یہیں تعلیم مکمل کی اور عثمانیہ یونیورسٹی سے فزکس
میں ام۔ ایس سی کر کے وہیں لیکچرر مقرر ہو گیا۔ ۱۹۸۶ء میں بہ حیثیت ریڈر
فزکس ریٹائر ہوا۔

'دوسرا کنارا' میرے منتخب ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے
لکھنے کا شغل ساری عمر جاری رہا مگر کتابی شکل دینے کا خیال اب آیا ہے
'دیر آئد درست آئد' والی بات اس پر صادق آتی ہے یا نہیں، اس کا
فیصلہ تو آپ کریں گے۔

غلام جیلانی

ایکویریم

(ایک کھیل ——— دو سین)

افراد :

اقبال (شوہر) : اچھے خد وخال ۔ عمر لگ بھگ (۴۵) سال
رضیہ (بیوی) : جاذب شکل وصورت ؛ عمر (۴۰) سال
زیبا : عمر (۳۰) اور (۳۵) کے درمیان ۔ خوب صورت اور خوش لباس ۔

پہلا سین

[رضیہ اور اقبال کے فلیٹ کا بیڈ روم ۔ سجاوٹ اور فرنیچر ایسا جیسا اونچے اوسط گھرانے کے معیار کا ہوتا ہے ۔ اقبال ہاتھ میں سے اخبار پھینک کر گھڑی میں وقت دیکھتا ہے اور پھر فرش پہ رکھا ہوا ایک بند سوٹ کیس اٹھا کر جیسے وزن کا اندازہ کرتا ہے —]

اقبال : یہ تم نے کیا کیا بھر دیا ہے اس میں ؟
رضیہ : (پلنگ پر لیٹی میگزین پڑھ رہی ہے ۔ مڑ کر جواب دیتی ہے) : تمہارے کپڑے ——
...... دو دن کے لحاظ سے ۔
اقبال : مگر یہ بہت وزنی ہے (سوٹ کیس نیچے رکھ دیتا ہے)
رضیہ : اپنے شیو کا سامان اور سگریٹ وغیرہ بیگ میں رکھ لو ...... ادرہاں دوائیں بھی ۔
اقبال : مگر اتنے سارے کپڑے ...... یہ بہت وزنی ہو گیا ہے ۔
رضیہ : رات کو جلدی سو جانا ۔ سمجھے ؟ ..... دو گھنٹے میں پہنچ جاؤ گے راجولا —— ؟

اقبال : (گھڑی دیکھ) ...... اُلّو کا پٹھّا ...... وہ ڈرائیور ...... موٹر ابھی تک نہیں لایا !

رضیہ : کیا کوئی اور آفیسر بھی ساتھ جا رہا ہے ؟

اقبال : نہیں ...... (جا کر سوٹ کیس پھر اٹھاتا ہے)

رضیہ : کیوں پریشان ہو رہے ہو ...... یہ تمہارے سر پر تو جائے گا نہیں ...... میں نے سب سوچ سمجھ کر رکھی ہیں چیزیں ...... ہمیشہ کی طرح۔

اقبال : ہمیشہ کی طرح ؟

رضیہ : ہاں۔ ٹور پر تمہیں جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے ......

اقبال : وہ تم جانتی ہو ؟

رضیہ : ہاں۔ دو دن کے لیے جاؤ تو کیا چیزیں ہوں ...... اور چار دن کے لیے جاؤ تو کتنی چیزیں ......

اقبال : تم سمجھتی ہو، تم سب جانتی ہو ؟

رضیہ : (غصّے میں) کیا مطلب ؟ میں نہیں جانتی ؟

اقبال : کیا ...... کیا جانتی ہو تم ؟ ...... کچھ نہیں جانتیں۔ بس سمجھ لیا ہے کہ جانتی ہو ...... کچھ نہیں جانتیں ......

رضیہ : کیا فضول باتیں کر رہے ہو !

اقبال : (ٹہلتے ہوئے) : دو دن کے لیے ...... اور چار دن کے لیے ......

[رضیہ غصّے میں جا کر سوٹ کیس کھول دیتی ہے اور کپڑے بکھر جاتے ہیں] :

اقبال : میں جانتا تھا تم ایسا ہی کرو گی۔

رضیہ : تم جانتے تھے ؟ ...... تم مجھے جانتے ہو ؟

اقبال : بہت اچھی طرح ...... (رک کر) لیکن نہیں ...... شاید نہیں جانتا۔ کسی عورت کو کوئی مرد نہیں جان سکتا ......

رضیہ : بیوی کو بھی نہیں ؟

اقبال : بیوی کو بھی نہیں ۔ اسی طرح جیسے بیوی شوہر کو نہیں جانتی ....
.... [فرش پر بکھرے کپڑے سوٹ کیس میں رکھنے لگتا ہے] سمجھتی ہے جانتی ہے ۔ مگر کچھ نہیں جانتی (آہستہ سے ہنستا ہے) کوئی بیوی نہیں جانتی ....
کوئی شوہر نہیں جانتا ...... اجنبی ...... ساری عمر اجنبی ....
(یکایک ایک سرخ رنگ کا سوئٹر زور سے پرے پھینک دیتا ہے، اور غصّے کے لہجے میں کہتا ہے) ...... یہ سرخ سوئٹر پھر میرے سامنے آگیا ! ....
(باہر دور سے موٹر کی آواز سنائی دیتی ہے)

رضیہ : شاید ڈرائیور آگیا۔

اقبال : نہیں ۔ یہ اس کا ہارن نہیں ہے ......

رضیہ : شاید تمہاری طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے۔

اقبال : میں بالکل ٹھیک ہوں ۔

رضیہ : نہیں، میں جانتی ہوں۔

اقبال : پھر وہی ۔ کیا جانتی ہو تم ؟

رضیہ : تمھیں کیا ہو گیا ہے ؟ کیوں ایسی فضول باتیں کر رہے ہو ! .... میں شاید کچھ اور جانوں یا نہ جانوں، تمھیں اچھی طرح جانتی ہوں ۔ (اقبال کے قریب آکر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) ...... اور یہ تم بھی جانتے ہو۔

اقبال : (پلٹ کر دور جاتے ہوئے) : تم بہت ذہین ہو، .... اور یہی میری ٹریجڈی ہے ۔

رضیہ : تو تم میری ذہانت کو مانتے ہو ...... میرا مطلب ہے جانتے ہو تم ....؟

اقبال : میں تمہارے ذہن کے گوشے گوشے کو جانتا ہوں ۔ ہماری شادی کو پندرہ برس ہو گئے ہیں۔

رضیہ : پھر ابھی .... یہ کیا کہہ رہے تھے ...... اجنبی .... ساری عمر اجنبی !

اقبال : (چپ چاپ جاکر دریچے سے باہر دیکھنے لگتا ہے) : یہ دھوپ اتنی زرد کیوں ہو رہی ہے؟

رضیہ : دھوپ نہیں تمھاری آنکھیں زرد ہو رہی ہوں گی۔

اقبال : (پلٹ کر) : بچّے کہاں ہیں؟

رضیہ : باہر میدان میں کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ تم نے ہی کہا تھا نا کہ تمھارے جاتے وقت وہ باہر ہوں تو اچھا ہے......

اقبال : ہاں - ہاں - کہا تھا......... مگر اب میں نہیں جا رہا۔

رضیہ : (حیرت سے چپ چاپ دیکھ کر) نہیں جا رہے؟ مگر تم نے کہا تھا کہ انسپکشن پر جانا ضروری ہے۔

اقبال : ہاں کہا تھا۔

رضیہ : کیا موٹر میں دیر ہو گئی اس لیے.....؟

اقبال : نہیں۔ اب موٹر آ بھی جائے تو نہیں جاتا۔

رضیہ : اچھا ہی ہے..... تمھاری طبیعت بھی......

اقبال : (بات کاٹ کر) : میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے...... (سوٹ کیس کے بکھرے ہوئے کپڑوں میں سے ایک کی جیب میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالتا ہے۔ اور کھول کر پڑھتا ہے)

رضیہ : پھر جاتے کیوں نہیں؟

اقبال : میری مرضی..... اور پھر تم کیا چاہتی ہو؟ میں جاؤں یا نہ جاؤں؟

رضیہ : مجھے کچھ نہیں معلوم..... [پلنگ پر لیٹ کر میگزین پڑھنے لگتی ہے]

اقبال : تو رضیہ...... تم یہ چاہتی ہو...... کیا چلا جاؤں؟

[رضیہ لیٹ کر چند سکنڈ اقبال کو خاموش دیکھتی رہتی ہے، پھر اُٹھ کر سوٹ کیس کے پاس جاتی ہے اور کپڑے جمانے لگتی ہے]

رضیہ : کیا میرا بتانا اتنا ضروری ہے؟ تم تو جانتے ہو........ میں کیا کہوں گی۔ جانتے ہو نا اقبال؟....... میرے ذہن کے گوشے گوشے کو.....؟

[اقبال ہاتھ میں کاغذ لیے ٹہل رہا ہے ۔ جاکر دریچے کے
سامنے کھڑا ہو جاتا ہے ـــــــــ]

اقبال : یہ دھوپ یقیناً زرد ہے .... میری آنکھیں ٹھیک ہیں ....

[رضیہ سوٹ کیس میں کپڑے جماکر، پلنگ پر جا لیٹتی ہے
اقبال کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ جاتا ہے]

رضیہ : اقبال ..... تم ایسا کرو ..... دو دن کی بجائے ایک ہی دن میں واپس آجاؤ اور ایک دن گھر میں مکمل آرام کرلو ۔

اقبال : (اپنی دھن میں) : اچھا رضیہ بتاؤ، کسی دن اسی طرح میرے کپڑے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے تمھیں کسی جیب میں کوئی خط مل جائے تو ..... کیا کروں گی ؟ (رضیہ خاموشی سے دیکھتی ہے) ...... جیسے ابھی ابھی یہ چٹھی نکلی ہے .... کیا کروگی تم ؟

رضیہ : (ہنسنے لگتی ہے) : تم ..... سچ مچ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ۔

اقبال : ہنسو مت رضیہ ۔ میری بات کا جواب دو ۔ کیا کروگی اس خط کا ؟

رضیہ : واپس رکھ دوں گی، جیب میں .... یا پھر تمھاری میز پر ....

اقبال : نہیں ۔ وہاں، تم نہیں رکھو گی .... کیوں کہ وہ کوئی سرکاری لیٹر نہیں ہے ۔

رضیہ : بکواس بند کرو اقبال ۔ میری جان مت کھاؤ (پلٹ کر میگزین کھولتی ہے)

اقبال : یہ بکواس نہیں ہے رضیہ ۔ مان لو وہ خط میرا پرائیوٹ ہو، ...... اور پتہ کسی عورت کی تحریر میں ہو ؟ ...... پھر کیا کروگی تم ؟ ......

[رضیہ پلٹ کر کچھ دیر خاموش دیکھتی ہے، اور پھر
زور سے ہنستی ہے ۔]

مذاق نہیں کر رہا ہوں میں .... تم ہنس کیوں رہی ہو ؟

رضیہ : اس لیے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے ـــــــــ میں جانتی ہوں ۔

اقبال : پھر وہی ! "میں جانتی ہوں" .... مان لو کہ تم کچھ نہیں جانتیں، اور ایک دن اسی طرح، کپڑے سوٹ کیس میں جماتے ہوئے ....

رضیہ : (اٹھ کر غصے میں جا کر سوٹ کیس کھول دیتی ہے۔ کپڑے بکھر جاتے ہیں) : اقبال اب تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ موٹر آئے تو ڈرائیور کو میں واپس کر دوں گی۔

اقبال : سنو رضیہ۔ میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا .... بس جانے کیوں، .... یوں سمجھو مجھے ضد ہو گئی ہے تم سے یہ بات پوچھنے کی .... تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔

رضیہ : (پلنگ پر بیٹھ کر دیکھتی ہے) : تم سچ مچ .... سیریس ہو، اقبال؟

اقبال : ہاں۔

رضیہ : سچ مچ؟

اقبال : (زور سے) : ہاں۔

رضیہ : (پلنگ سے اتر کر ٹہلنے لگتی ہے) : تمہاری جیب سے کسی عورت کا بھیجا ہوا خط نکلتا ہے .... (مسکراتی ہے) اس میں سے بھینی بھینی خوشبو آتی ہے .... (گردن ہلاتی ہے) ..... تو میں یہ سمجھ لوں کہ تمہارا کسی سے .... افیر چل رہا ہے؟

اقبال : مان لو کہ چل رہا ہے۔ تو تم کیا کرو گی، ...... کیا وہ خط کھول کر پڑھو گی؟

رضیہ : (جیسے سوچتے ہوئے) : .... بڑا مشکل ہے۔

اقبال : کیا مشکل ہے؟ .... افیر چلنا .... یا خط پڑھنا؟

رضیہ : دونوں ______ (جلدی سے) لیکن ٹھہرو۔ اگر پہلی چیز کا مجھے یقین ہو جائے تو پھر شاید .... میری دلچسپی بڑھ جائے۔

اقبال : دلچسپی؟

رضیہ : ہاں۔ پھر شاید میں اس عورت کے بارے میں معلوم کرنا چاہوں۔

اقبال : کیا معلوم کرنا چاہو؟

رضیہ : ایں ؟........ ہاں - بہت سی چیزیں .... مثلاً سب سے پہلے تو اس کا نام ؟

اقبال : نام ؟ .... سب سے پہلے نام ؟ .... اچھا تو اس کا نام صغریٰ ہے -

رضیہ : صغـریٰ ؟!

اقبال : اچھا جانے دو - صغریٰ نہیں محمودہ ہے -

رضیہ : اگر اس کا نام محمودہ بھی ہے تو ممکن ہے میں سارے معاملے کو اہمیت ہی نہ دوں !

اقبال : زیبا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے ؟

رضیہ : زیبا ؟........ زیبا........ ہاں - اچھا نام ہے -

اقبال : اچھا چلو .... نام معلوم ہوگیا .... اس کے بعد کیا کروگی ؟

رضیہ : ہاں .... (جیسے سوچتے ہوئے) .... اس کے بعد کیا کروں گی ! .... میں وہ خط واپس تمہاری جیب میں رکھ دوں گی - صرف اُس کا پتہ نوٹ کرلوں گی .... اور بس -

اقبال : پڑھوں گی نہیں ؟

رضیہ : نہیں مجھے اندازہ ہے اس میں کیا لکھا ہوگا .... وہی داستان جو روزِ ازل سے .... لیکن نہیں - اس میں یہ سب نہیں ہوگا -

اقبال : پھر کیا ہوگا ؟

رضیہ : اس میں تم سے شکوے شکایت نہیں ہوں گے .... حکم نامہ ہوگا .... بلانے کا -

اقبال : تمہیں کیسے معلوم ؟

رضیہ : اس لیے کہ میں سوچ سکتی ہوں وہ عورت کیسی ہوگی ؟!

اقبال : کیسی ہوگی ؟

رضیہ : (آہستہ آہستہ قریب آکر) .... دیکھنے میں اچھی بھلی اسمارٹ .... مجھ سے یقیناً کم عمر ہوگی .... نمائش اور زیبائش کی بھی شوقین

ہو سکتی ہے، لیکن زیادہ نہیں۔ لیکن ذہین ضرور ہوگی۔ تمھیں ذہین عورت پسند ہے۔
ذہین اور ہنس مکھ ...... اور مال دار۔ تمھارا انیسر مفلسی میں نہیں چل سکتا
...... تم آرام پسند جو ہو .... اور وہ ..... یقیناً تم پر حکومت
چلائے گی'.......

اقبال : تم اس سے ملنا نہیں چاہو گی ؟

رضیہ : ضرور چاہوں گی۔ اسی لیے اس کا پتہ نوٹ کرلوں گی۔

اقبال : تاکہ اس سے مل کر یہ دیکھ سکو کہ تمہارا اندازہ کہاں تک درست ہے'......
اور تمھیں تشفّی ہو جائے کہ تم اس سے زیادہ ذہین ہو....... اچھا تم کہو گی
کیا اس سے ؟

رضیہ : یہ بات مشکل ہے ..... میرا مطلب ہے یہ بتانا مشکل ہے کیا باتیں کروں گی
اس سے ؟ ..... لیکن اتنا یقینی ہے کہ فلموں کا گھسا پٹا سین نہیں دہراؤں گی...

اقبال : (اٹھ کر خاموشی سے کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے' اور باہر دیکھتا رہتا ہے) :
میں رنگوں کے اس جال میں گھر کر رہ گیا ہوں رضیہ .... ان کے لمبے لمبے ہاتھ
ہر طرف سے میری طرف بڑھتے رہتے ہیں' اور عجیب بات یہ ہے رضیہ ....
میرے ساتھ کھڑے دوسرے لوگ محسوس بھی نہیں کر پاتے! .... یوں لگتا ہے
جیسے سرخ آنکھیں....... اور زرد تیلیاں ساری بھیڑ میں مجھی کو گھور رہی
ہیں........

رضیہ : اور تم ڈر جاتے ہو...... تم تو چمڑے کے اس ہینڈ بیگ سے بھی ڈر جاتے ہو'
[جا کر ایک طرف پڑے ہوئے ایک میلے بادامی رنگ کے ہینڈ بیگ
کو اٹھا کر دکھاتی ہے ــــــ چمڑے کا پرانا بیگ ہے '
جس کے ڈیزائن میں لکیروں کا بے تکا سا جال بنا ہوا ہے۔]
...... اسی لیے اس مرتبہ میں نے اس میں تمہارا سامان نہیں رکھا.....
..... ڈر! ..... آخر یہ کیسا ڈر ہے!!

اقبال : (ہینڈ بیگ کو دیکھ کر سہم سا جاتا ہے) : دیکھو' اس پر یہ شگاف' یہ لکیریں .... جیسے سوکھے تالاب کی تڑخی ہوئی زمین .... (چہرے کو ہاتھوں میں ڈھانپ لیتا ہے۔ پھر چند لمحے بعد سر اٹھا کر بیگ کو گھورنے لگتا ہے .....) اسے میرے سامنے کیوں لے آئیں رضیہ؟ .... چمڑے کی لکیروں کا یہ جال مجھے ابا کے چہرے پر پھیلی ہوئی جھرّیوں کی یاد دلا دیتا ہے ...... رضیہ یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو .... ان کا چہرہ میرے سامنے آکھڑا ہوتا ہے'........ جانے کہاں سے ....!

رضیہ : انہیں دیکھتے ہی تم بزدل بن جاتے ہو ...... تم سدا ان سے ڈرتے رہے .... وہ نہیں رہے' لیکن اپنا ڈر چھوڑ گئے ______

اقبال : بس کرو رضیہ۔ میں اس جال سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہا ہوں اور ..... تم ہو کہ .... مگر تم کچھ نہیں جانتیں .... تمھارا کیا قصور! .... تم کچھ نہیں جانتیں .... تم کچھ نہیں جانتیں .... (غصّے میں چیخ کر) یہ ڈرائیور کم بخت ابھی تک موٹر کیوں نہیں لایا؟ .... میں جاؤں گا .... رضیہ میں نے سوچ لیا ہے' میرا آج جانا بہت ضروری ہے .... ورنہ پھر شاید کبھی نہ جا سکوں' .... دیکھو وہ اب آتا ہی ہوگا...

[رضیہ چند سکنڈ چپ چاپ اقبال کو دیکھتی رہتی ہے'
پھر جیسے فیصلہ کر کے سوٹ کیس میں کپڑے ڈالنے لگتی ہے۔]

رضیہ : میرا بھی یہی خیال ہے; تم ...... تمھیں جانا چاہیے۔

اقبال : اور دیکھو' وہ سرخ سوئٹر بھی اس میں رکھ دو .... رات کی خنکی میں اسے پہنوں گا ...... اور ...... اور پھر وہ ہینڈ بیگ ... چہرے کی جھرّیوں والا ہینڈ بیگ (جا کر اُسے اٹھا لاتا ہے) یہ بھی میرے ساتھ جائے گا .... اگر میں اسے نہیں لے گیا تو یہ خود میرے ساتھ ساتھ آئے گا ..... (اُسے دیکھ کر آہستہ سے مسکراتا ہے) مگر .... مگر اسے نہیں معلوم اب میں

اسے کیوں لیے جا رہا ہوں! ...... اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کے لیے ......
اسے ...... اسے قتل کر دینے کے لیے ...... اور پھر میں آزاد ہو جاؤں گا۔

رضیہ : آزاد ہو جاؤ گے تم؟ ...... (اقبال پلٹ کر رضیہ کو دیکھتا ہے) ......
سوٹ کیس میں کپڑے بار بار نکالنے اور رکھنے میں اُلٹ پلٹ ہو گئے ہیں۔
بے ترتیب پڑے ہیں۔

اقبال : میرے دماغ میں خیالات کی طرح ......

رضیہ : ٹھہرو۔ میں انہیں سلیقے سے جما دیتی ہوں۔

اقبال : (چیخ کر) : نہیں ...... انہیں ایسے ہی رہنے دو ......

[باہر موٹر کے رکنے اور ہارن کے بجنے کی آوازیں آتی ہیں]

...... اب وقت بھی نہیں رہا۔ موٹر آگئی ہے۔

رضیہ : مگر اقبال ...... زیبا والی بات ادھوری رہ گئی ......

اقبال : اب وقت نہیں رہا رضیہ ...... (خالی ہینڈ بیگ کو بھی سوٹ کیس میں ڈال کر
سوٹ کیس بند کر دیتا ہے) ...... آخر یہ بند ہو گیا! ......

(چہرے پر مسرت چھا جاتی ہے۔ سوٹ کیس اٹھا کر جانے لگتا ہے)

...... اور پھر کئی باتوں کا جواب تو تم نے دے بھی دیا ہے ...... اچھا
...... (رضیہ کو گھور کر دیکھتا ہے) خدا حافظ ...... رضیہ

رضیہ : خدا حافظ ...... مگر اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو ...... تم تو صرف
راہول جا رہے ہو تو ...... صرف دو گھنٹے کے فاصلے پر ہے

اقبال : ایں؟ ...... ہاں۔ دو گھنٹے ...... بلکہ شاید اس سے بھی کم...
...... (چلا جاتا ہے ...... دور سے آواز آتی ہے) بچے پوچھیں تو کہہ دینا
بس دو دن میں آ جاؤں گا ......

[رضیہ دریچے کے پاس کھڑی ہو کر خاموش سی باہر دیکھتی رہتی]

دوسرا سین

[زیبا کا کمرہ۔ جو اس کی مصوّری کا اسٹوڈیو بھی ہے۔ جگہ جگہ پینٹنگس اور پورٹریٹس نظر آتے ہیں۔ کئی پورٹریٹس دیواروں پر آویزاں ہیں کمرے میں ایک طرف ایک بڑا سا ایکوریم ہے۔ فرنیچر تھوڑا سا لیکن ستھرے ذوق کا پتہ دیتا ہے۔ بیچ میں ایزل پر کینوس چڑھا ہوا ہے، اور زیبا اس کے سامنے کھڑی ہے۔ کینوس پر اقبال کا پورٹریٹ ہے، اور زیبا رک رک کر اسے برش کی مدد سے سنوارتی جاتی ہے ہولے ہولے گنگنا بھی رہی ہے۔

زیبا کے بال ترشے ہوئے ہیں۔ ہلکے نیلے رنگ کا گون پہنے ہوئے ہے جس کی آستینیں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ہلکا سا میک اپ دل کشی میں اضافہ کر رہا ہے۔

...... ایک طرف سے کھلے دروازے کا پردہ اٹھا کر رضیہ اندر آجاتی ہے ...... اسے دیکھ کر زیبا چونک جاتی ہے۔]

رضیہ : شاید آپ مجھے دیکھ کر چونک گئیں۔ معافی چاہتی ہوں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو اک ذرا سی دیر کے لیے اندر آجاؤں ؟

زیبا : اندر تو آپ آ ہی چکی ہیں۔

رضیہ : (جواب کا انتظار کیے بغیر اندر آ کر تصویروں کو دیکھتی ہوئی پھرتی ہے) ..... اچھی ہیں ...... بلکہ خاصی اچھی ہیں۔ یہ سب آپ ہی کی بنائی ہوئی ہیں ؟

زیبا : جی ہاں۔

رضیہ : اور یہ فلیٹ آپ ہی کا ہے ...... میرا مطلب ہے ...... اس کی مالک ...... آپ ہی ہیں !

زیبا : جی ہاں۔

رضیہ : میرا بھی یہی خیال تھا ..... (مڑ کر) ..... اچھی ہیں۔ لیکن میں نے

کہیں سنا یا پڑھا نہیں آپ کے بارے میں!

زیبا : میں ابھی اتنی مشہور نہیں ہوئی .... لیکن آپ کو یقین ہے آپ کو یہیں آنا تھا!

رضیہ : ہر چیز میرے اندازے کے مطابق نکلی .... (زیبا کے قریب آکر اسے غور سے دیکھتی ہے) .... بالکل ویسی ہی .... بس اک عمر ذرا سی زیادہ ہو گی .... مگر بہت زیادہ نہیں ....

زیبا : میں سمجھی نہیں۔

رضیہ : (کینوس پر اقبال کا پورٹریٹ دیکھنے لگتی ہے) : خوب ...... بہت خوب ...... چہرے آپ بہت عمدہ بنا لیتی ہیں۔

زیبا : شکریہ۔ میرے دوستوں کا بھی یہی خیال ہے۔

رضیہ : (پلٹ کر دیوار پر آویزاں پورٹریٹس دیکھتی ہے) : یہ سب بھی آپ کے دوستوں کے پورٹریٹس ہوں گے ....؟ (زیبا کی طرف پلٹ کر دیکھتی ہے .... ——— زیبا چپ رہتی ہے) کتنی خوش قسمت ہیں آپ .... مگر ان میں زیادہ تعداد ماضی کے دوستوں کی ہو گی ....!

زیبا : (بگڑ کر) میں نہیں جانتی آپ کیا کہہ رہی ہیں! اور آپ کون ہیں؟

رضیہ : (اقبال کے پورٹریٹ کو غور سے دیکھ کر) : ویری گڈ .... بس اک یہاں ذرا ...... لیکن آپ بُرا تو نہیں مان جائیں گی اگر تنقید کروں تو؟

زیبا : جی نہیں۔ ضرور کیجیے .... ویسے میں آپ کی کئی باتوں کا بُرا مان سکتی تھی۔

رضیہ : — (اپنی دھن میں) : آپ نے یہاں .... ہونٹوں میں گڑبڑ کر دی ہے۔

زیبا : ہونٹوں میں؟ .... میں تو سمجھ رہی تھی، وہ ٹھیک ہیں۔

رضیہ : اوپر کا ہونٹ .... صحیح نہیں بنا ہے۔ اسے ذرا اور ..... وہ کیا کہتے ہیں .... اُبھرا ہوا ہونا چاہیے تھا۔

زیبا : اچھا؟ .... لیکن یہ آپ کو کیسے معلوم؟

رضیہ : البتہ آنکھیں ٹھیک ہیں ...... بہت عمدہ ہیں؛ میرا مطلب ہے یہ آنکھیں کوئی خوب صورت نہیں ہیں ..... بس، ان میں صحیح کیفیت پیدا کی ہے آپ نے۔

زیبا : بے حد شکریہ۔ لیکن ان آنکھوں اور ہونٹوں کو آپ کیسے جانتی ہیں ؟

رضیہ : زیبا۔ میں اقبال کی بیوی ہوں۔

زیبا : (حیرت زدہ) : بیوی !!

رضیہ : ہاں - اور میرا نام رضیہ ہے؛

زیبا : (بے یقینی سے) :- اقبال کی بیوی ؟!

رضیہ : تمھارا کیا تصور تھا میرے بارے میں ؟

زیبا : (بے بس سی ہو کر بیٹھ جاتی ہے) کوئی نہیں - میں نہیں جانتی تھی کہ اقبال کی بیوی بھی ہے !

رضیہ : تم چاہتی ہو میں اس بات پر یقین کرلوں ؟

زیبا : تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں ؟ .... (اُٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے) مجھے آج تک نہیں معلوم تھا کہ .... (رک کر) لیکن آپ یہاں کس لیے آئی ہیں ؟ .... کیا چاہتی ہیں ؟

رضیہ : دیکھو زیبا۔ باتیں نرمی اور سکون سے ہوں تو اچھا ہے .... میں یہاں کیوں آئی ہوں ..... ظاہر ہے کہ اقبال کے لیے ....

زیبا : سکون اور نرمی .... ؟

رضیہ : ظاہر ہے کہ تم یہ بھی نہیں جانتی ہوگی کہ اقبال کے بچے بھی ہیں .... یعنی .... یعنی ہمارے بچے ....

زیبا : (جیسے اپنے آپ سے) : بچے ——— !

رضیہ : تم اس کرسی پر بیٹھ کر باتیں کرو .... شاید تمھاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔

زیبا : آپ میری فکر نہ کریں .... میں ٹھیک ہوں (بیٹھ جاتی ہے) ...... آپ کو دیکھ کر مجھے کوئی .... غش نہیں آگیا، بس ذرا اپ سٹ

ہوگئی ہوں، ـــــــ اور بس

رضیہ : میں جانتی ہوں تم کمزور نہیں ہو۔ (جاکر ایکویریم دیکھنے لگتی ہے)

زیبا : آپ یہاں ...... کس مقصد سے آئی ہیں؟

رضیہ : (پلٹے بغیر جواب دیتی ہے) : ڈرو مت ـــــــ میں اقبال کو لے جانے نہیں آئی ہوں۔

زیبا : (جیسے خود سے) : لیکن ...... لیکن اقبال نے مجھے بتایا کیوں نہیں آپ کے بارے میں !؟

رضیہ : کیا میں یقین کرلوں زیبا، .... یہ اس طرح کا، پہلا تجربہ ہے تمھاری زندگی میں؟

زیبا : یعنی؟

رضیہ : یعنی یہ کہ ـــــــ (دیوار پہ پورٹریٹس کی طرف بتاتے ہوئے) ان میں کوئی بھی شادی شدہ نہیں تھا؟ (جلدی سے) اچھا جانے دو .... تم خفا ہورہی ہو۔ سنو۔ اقبال نے بھی مجھے تمھارے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

زیبا : مجھے اس سے کوئی دل چسپی نہیں اور نہ میں آپ کی باتوں سے خفا ہورہی ہوں بلکہ شاید ...... ایک تشفّی ہورہی ہے کہ آپ کا اندازہ غلط نکلا..... کم از کم ایک بار آپ سے غلطی ہوئی ہے۔

رضیہ : ہاں، زیبا .... تم نے میرے اس یقین کو توڑ دیا ہے کہ میں لوگوں کو سمجھ لیتی ہوں۔ میں سمجھتی تھی تم پوچھو گی میں یہاں کیسے پہنچی !..... کب سے جانتی تھی تمھارے بارے میں ـــــــ؟

زیبا : اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟

رضیہ : نہیں۔

زیبا : ـــــــ اصل بات یہ ہے کہ ہم دونوں یہاں اس وقت ...... زندگی

میں پہلی بار ملے ہیں ... اور چند منٹ بعد بچھڑ جائیں گے .... ہمیشہ کے لیے!
پھر ساری عمر شاید کبھی نہ ملیں اور ...... ان چند منٹوں میں ہمیں زندگی کے
سب سے اہم فیصلے کرنے ہیں .... ایک دوسرے سے مل کر، .....
پرانے دوستوں کی طرح .... کیسی عجیب بات ہے — !

[رضیہ چپ چاپ سنتی رہتی ہے .... باہر کے دروازے سے اقبال داخل
ہوتا ہے ؛ ہاتھ میں بہت چھوٹا سا بریف کیس ہے ——————
دونوں کو دیکھ کر ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے .. پھر آہستہ آہستہ آکر بریف
کیس میز پر رکھ دیتا ہے]

زیبا : (خاموشی کو توڑتے ہوئے) : رضیہ .... ایک بات میں آپ کو بتا دوں۔
اقبال اب یہاں نہیں رہیں گے۔

رضیہ : میں نے ابھی کہا تھا نا ...... میں اقبال کو لینے نہیں آئی ہوں۔

اقبال : (بے چین سا) : مگر میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں ...... تم دونوں سے ....

رضیہ : اس کی ضرورت نہیں ہے ..

زیبا : کہنے کو اب کچھ رہا بھی نہیں ہے اقبال۔

اقبال : رضیہ .... میں ...... مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں سرخ اور زرد دھاگوں
کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا ..... بھریوں کے جال کو پھاڑ کر نکل بھاگنا
چاہتا تھا .... اور جانتی ہو، بھاگ کر کہاں آنا چاہتا تھا .....؟

زیبا : (دیوار پر لگے پورٹریٹس کو دیکھ کر) : سب یہی کوشش کرتے ہیں۔

رضیہ : لیکن کیا کامیاب ہو پاتے ہیں؟

زیبا : صرف دیوار پر ٹنگے رہ جاتے ہیں ——————

اقبال : کیا کہہ رہی زیبا —————— !؟

رضیہ : زیبا نے ٹھیک کہا ہے .... وہ کبھی زیبا کی قید سے آزاد نہیں ہو سکیں گے
وہ دیوار پر ٹنگے ہوئے نہیں بلکہ اپنے اپنے مداروں پر گھوم رہے ہیں، اور اگر..

۔۔۔۔۔ کوئی مدار خالی ہو بھی جائے تو زیبا فوراً اس کی جگہ پُر کر لیتی ہے ۔ وہ ان کے درمیان رہنا چاہتی ہے، ۔۔۔۔۔۔ ہے نا زیبا ؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔

اقبال : تم زیبا کی ۔۔۔۔۔۔۔ توہین کر رہی ہو رضیہ ۔۔۔۔۔۔۔

زیبا : انہیں کہنے دو اقبال ۔۔۔۔۔۔۔۔ شاید زندگی میں پہلی بار کوئی مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا ہے ـــــــ

اقبال : اب تک سب جھوٹ بولتے رہے ہیں ؟

زیبا : ہاں ـــــــ جھوٹ

اقبال : تو یہ سب تمہارا کھیل تھا ـــــــ ؟

رضیہ : نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ زندگی کا سہارا۔

اقبال : ۔۔۔۔۔۔۔۔ سہارا ؟

زیبا : زنجیریں ۔۔۔۔۔ پاؤں کی زنجیریں ۔

اقبال : زنجیریں ۔۔۔۔۔۔۔۔ !

زیبا : تم نہیں سمجھ سکو گے اقبال ۔۔۔۔۔۔ ہم سب اپنی اپنی قیدوں میں بند ہیں ۔۔۔۔۔ میں تم اور رضیہ ۔۔۔۔۔۔۔ قید خانے مختلف ہیں۔

اقبال : (حیران سا) : یہ کیسی باتیں ہو رہی ہیں - میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ! ۔۔۔۔۔ (حیران سا دیکھتا رہتا ہے)

رضیہ : (ایکوریریم کے قریب جا کر) : اپنی دانست میں یہ مچھلیاں کتنی خوش ہیں ! ۔۔۔۔۔۔ یہ رنگ برنگی، تیرتی ہوئی مچھلیاں پانی کے اس مستطیل کی قید سے کبھی نکل نہیں سکتیں ۔۔۔۔۔۔۔ [اقبال اور زیبا بھی پاس آ کھڑے ہوتے ہیں] اور ان کی دیکھ بھال میں زیبا کو کتنی دل چسپی ہوتی ہے ! ۔۔۔۔۔۔ کتنی خوشی ! یہ ایکوریم کمرے کی زینت نہیں، زیبا کی ضرورت ہے ؛ زیبا کے ذہن کا ہم راز' ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (پلٹ کر) ۔۔۔۔۔۔ اس میں وہ سارے پورٹریٹ تیر رہے ہیں، جو دیواروں پر آویزاں ہیں۔

اقبال : (زور سے) : رضیہ ....!

رضیہ : اوہو ہم .... یعنی ہم سب .... تم اور میں اور زیبا .... اس کے باہر الگ الگ اپنے ایکویریم میں تیر رہے ہیں۔

[اقبال حیرت زدہ ، خاموشی سے دونوں کو تکتا رہتا ہے۔
پردہ آہستہ آہستہ گرتا جاتا ہے]
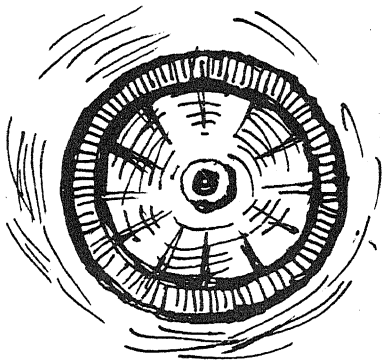
چوتھا محور

(ایکانکی کھیل)

کردار : (جس ترتیب میں اسٹیج پر آتے ہیں)

۱۔ سیل رواں	۵۔ نسرین
۲۔ شخص	۶۔ ضعیف آدمی
۳۔ عورت	۷۔ کمال الدین
۴۔ اختر	۸۔ نی سا

ہر کردار کی عمر، لباس، خدوخال وغیرہ کی تفصیل
منظر نامہ کے ساتھ ہی دی گئی ہے۔

- اسکے علاوہ (ا) ڈانس ٹروپ :

ایک مرد - جو شیوا کا تانڈوا ناچ ناچتا ہے
ایک چودہ پندرہ برس کا لڑکا - جو شیوا کا نادا نتا ناچ ناچتا ہے
دو مرد، اور دو عورتیں - پہلے ناچ میں سنگت کے لیے

(ب) آٹھ دس مرد، عورتیں اور بچے

منظر (۱) :

[پردہ اٹھنے کے چند سکنڈ پہلے ہی سے شیوا کے تانڈوا ناچ کی گت ستار پر مردنگ کی سنگت میں شروع ہو جاتی ہے۔ ساتھ میں راگ بسنت یا بہار میں الاپ ... اسٹیج پر مکمل اندھیرے میں پردہ اٹھتا ہے، اور روشنی کے دائرے میں شیوا تانڈوا ناچ شروع کر دیتے ہیں۔ گھنگھرو کی جھنکار کیساتھ دو مرد اور دو عورتیں بھی مختلف سمتوں سے آکر شیوا کے ساتھ ناچ میں شریک ہو جاتی ہیں، .... آہستہ آہستہ روشنی بڑھ کر سارے اسٹیج پر پھیل جاتی ہے۔

اسٹیج کے پچھلی جانب ایک درخت کے نیچے "سیل رواں" کھڑا نظر آتا ہے؛ آس پاس کچھ جھاڑیاں ہیں، پاس ہی ایک چبوترا سا ہے جس پر ایک شخص بیٹھا ہے۔

"سیل رواں" بوڑھا کردار ہے جسکی صحیح عمر کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ سفید چمکیلے بالوں میں، عمر رسیدہ مگر صحت مند، دلکش خدوخال والا ذہین چہرہ۔ لمبا قد۔ سفید گون نما قبا پہنے ہے جنکو رنگین ریشمی ڈوریاں سہارے ہوئے ہیں : آواز میں کشش ہے۔

چبوترے پر بیٹھا ہوا شخص کرتا اور دھوتی پہنے ہوئے ہے۔ کسی بھی عام ہندوستانی کے سے خدوخال۔ چہرے سے اکتاہٹ اور سستی جھلکتی ہے۔ عمر چالیس سے ساٹھ تک کچھ بھی ہو سکتی ہے۔

کوئی پانچ منٹ بعد شیوا اور پارٹی اسٹیج کے بائیں جانب، ناچتے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی اسٹیج کے دائیں جانب سے کوئی آٹھ دس مرد عورتوں اور بچوں کا ایک سلسلہ سا بائیں جانب شیوا کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ سروں پر اور ہاتھوں میں گٹھریاں اور دوسرا سامان ہے۔ عورتوں کی گودوں میں اور ہاتھوں سے چمٹے ہوئے چھوٹے بچے بھی گھسٹتے ہوئے جا رہے ہیں۔ قدم لڑکھڑاتے ہوئے یوں اٹھ رہے ہیں جیسے کمزور، بیمار فاقہ زدہ لوگوں کے اٹھتے ہیں۔ اسٹیج پر خاموشی چھا چکی ہے۔]

سیلِ رواں : اب کیوں ؟ ——— آخر اب کیوں شیوا کو تانڈوا ناچ کی سوجھی ہے !
...... صدیوں بعد، قرنوں بعد ! .... !؟

شخص : (جو چبوترے پر بیٹھا ہے، ہاتھ سے چپ رہنے کا اشارہ کرتا ہے) : شش ....
چپ رہو ..

سیل رواں : تم چپ رہو۔ کیا تم وجہہ جانتے ہو ؟ .... یہہ کونسا مذاق ہے ؟
دنیا جو پہلے ہی سسکتے ہوئے، بلبلاتے ہوئے لوگوں سے ابل پڑی ہے،
اسمیں اب کونسی تخلیق .... کونسی خوشی، کونسی امنگ پھونکنی ہے نٹ راج کو ؟

شخص : (بے زار سا) : چپ رہو ....

سیل رواں : تم چپ بیٹھے رہو ...... تم کیا جانو ؟ ..... یہہ قافلے کہاں جا رہے ہیں .. !

شخص : جانے دو انہیں ....

[لوگوں کا سلسلہ گذر جاتا ہے۔ لیکن ایک چھوٹا سا بچہ زمین پر بیہوش پڑا
اکیلا رہ جاتا ہے۔ فوراً ہی بائیں جانب سے اسکی ماں آکر اسے اٹھا لیتی
ہے، دہشت زدہ ہو کر سینے سے چمٹا لیتی ہے، اور ادھر ادھر
پریشان نظروں سے دیکھتی ہے]

سیل رواں : (عورت کے قریب آکر) : کہاں جانا ہے ؟

عورت : نہیں معلوم

سیل رواں : تو پھر واپس چلی جاؤ۔

عورت : مجھے جانا ہے .... وہ لوگ (بائیں جانب دیکھتی ہے) ....

سیل رواں : وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں ؟

عورت : موت کی طرف ....

سیل رواں : کہاں سے آ رہے ہیں ؟

عورت : موت سے نکل کر ......

سیل رواں : تو پھر جاؤ ...... جلدی جاؤ .... وہ لوگ آگے نکل گئے تو

اکیلے ہی مرنا پڑے گا.....

[عورت خوف زدہ ہوکر بائیں جانب بھاگ جاتی ہے]

شخص : (چبوترے سے اٹھکر قریب آتا ہے) : کون ہو تم ؟ ...... ظالم، سفاک، بڈھے .... ؟

سیلِ رواں : .... تم ہی نے سارا کھیل بگاڑا ہے۔

شخص : کیوں آئے ہو یہاں ...... میرا امن خراب کرنے ...... ؟

سیلِ رواں : بے حس ...... بے جان پتھر ...... چلے جاؤ۔ اس جگہ تم کیوں آئے ہو؟۔ ...... مجھے یہاں کام ہے ....

شخص : کام ——— ؟

سیلِ رواں : ہاں۔ مگر کام کے تم بھول چکے ہو ...... برسوں سے

شخص : میں سمجھا نہیں .....

سیلِ رواں : سمجھ بھی نہیں سکتے ...... تم نے سمجھنا بھی چھوڑ دیا ہے .... تمہاری اس بے حسی، بے تعلقی نے ہی دنیا کی اس بھیڑ کو، اس ہجوم کو پریشان کر رکھا ہے۔

شخص : تو تم مجھے جانتے ہو! .....

سیلِ رواں : جاؤ، یہاں سے چلے جاؤ...... مجھے اس سے تنہائی میں ملنا ہے۔

شخص : کہاں جاؤں ؟

سیلِ رواں : بھیڑ میں شامل ہو جاؤ ...... ہجرت، ترکِ وطن ..... مائگریشن .....

شخص : مائگریشن؟

سیلِ رواں : ساری دنیا اس اتھل پتھل کا شکار ہے، تم نہیں جانتے؟ ..... بے حسی جھاڑ کر، ذرا دیکھو، ہر جگہ، ہر ملک میں ...... یہ قافلے کیوں اور کہاں جا رہے ہیں؟ ..... ان کے دکھ ..... ان کے درد ... کیا ہیں ؟

شخص : تم کون ہوتے ہو مجھے حکم دینے والے ....

تم نے میرے آرام میں خلل ڈال دیا ہے۔ مجھے .... مجھے لوگوں کی بھیڑ اور قافلوں سے کیا غرض! ..... مجھے سونا ہے ....

[جاکر واپس اسی چبوترے پر بیٹھ جاتا ہے]

سیل رواں : کب سے سوئے پڑے ہو ..... ناگ پھنکارتے پھر رہے ہیں ...... کل کے سنپولئے .... جنھیں تم ہی نے دودھ پلایا تھا۔

شخص : تم آخر ہو کون ——— ؟

سیل رواں : ایسا نہ ہو تم سوتے میں مر جاؤ .... تم اکیلے نہیں ہو ...... تمہیں زندہ رہنا ہے۔ انگڑائی لے کر کھڑے کیوں نہیں ہو جاتے؟ ...... سارے ناگ بلوں میں گھس جائینگے۔

شخص : بتاؤ گے نہیں تم کون ہو؟ ...... کیا نام ہے تمہارا؟

سیل رواں : چوتھا محور۔

شخص : میں سمجھا نہیں۔

سیل رواں : سیل رواں۔ (شخص حیرانی سے دیکھتا رہتا ہے) ..... تمہاری سوچ بھی جاتی رہی ہے۔ اب ...... اب یہاں سے چلے جاؤ.. مجھے ملنا ہے .... تنہائی میں باتیں کرنی ہیں ....

شخص : ملنا ہے ...... تنہائی .... شرم نہیں آتی! .... اپنی عمر دیکھو!

سیل رواں : میری عمر ——————— تم کیا جانو!

شخص : کون ہے وہ؟

سیل رواں : میری تخلیق .... شاہکار میرا۔

شخص : تمہاری محبوب!

سیل رواں : (اثبات میں گردن ہلاتا ہے) : ہاں ..... ننھی کونپل ..... کومل کرن۔

شخص : بہت خوب صورت ہے؟

سیل رواں : میں نے اسمیں وہ ساری خوبصورتی بھردی ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں مل سکتی تھی ۔

شخص : تم نے ... ؟

سیل رواں : .... جاؤ ، مجھے تنہا چھوڑ دو .... آج وہ یہاں آئے گی ..
..... مجھ سے ملنے ۔ ابھی کچھ باتیں باقی ہیں ۔

شخص : تنہا ؟ .... کیسی تنہائی ؟ تم نے ہی تو کہا تھا .... بھیڑ ...
ہجوم .... قافلے ....

سیل رواں : ہجوم اور بھیڑ میں ہی ہر شخص تنہا ہے .... وہ کھو گیا ہے ....
ہجوم میں نہیں ، اپنے آپ میں ، اپنی ہی تلاش میں ....
... راستہ سجھائی نہیں دیتا ۔

شخص : کیسا راستہ ؟

سیل رواں : پہاڑ کا ۔

شخص : پہاڑ ؟

سیل رواں : یہی ہوتا ہے ، جب ہزاروں برس بعد ..... سمے کینچلی بدلتا ہے ۔ جب شیشے میں ریت کے ذروں کا نیا ڈھیر بھرنا پڑتا ہے ..... پہئے کو مسلسل گھومنا ہے ۔

شخص : (ہولے سے ، اپنے آپ میں) ...... چوتھا محور ۔

سیل رواں : مگر نی سا کا پہیہ ابھی رکا ہوا ہے ۔

شخص : نی سا ؟!

سیل رواں : سرگم ..... جو آج ملنے آرہی ہے (رک کر شخص کی طرف دیکھتا ہے)
...... ہر سرگم کا آخری سُر ، اگلی سرگم کے پہلے سُر کو چھیڑ دیتا ہے .....
نی سا .... ایک دور جاتا ہے ، دوسرا آتا ہے ۔

شخص : تمہاری نی سا کی عمر کیا ہے ؟

سیل رواں : (توقف سے) : مگر .... ابھی شروع نہیں ہوئی۔ پہیہ رکا ہوا ہے۔
مگر .... مگر اب تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں۔ اکیس سے شروع ہو جائیگا۔

شخص : اکیس سے ؟!

سیل رواں : [ٹہلتے ہوئے، جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہے] ..... ننھی سی جان
اسے کیا کیا اپنے دامن میں سمیٹنا پڑ رہا ہے۔ دو دو جنگوں کا دھنواں .....
زہری ہتھیاروں کے انبار ...... آلودگی کا زہر ..... سائینس کی
پرواز کی دو دھاری تلوار .... (رک کر) .... میں ہی ذمہ دار ہوں
.... اپنے محور کا پیمانہ بدل نہیں سکتا ...... مجبوری تھی ....
مگر .... جو کچھ اسے دے رہا ہوں، اس سے باخبر بھی رکھ رہا ہوں ...
.... اسے بتاتا جا رہا ہوں ...... ہر ملاقات میں - کیونکہ ....
[شخص کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے] اب تھوڑا ہی سا وقت رہ گیا ہے۔
..... اکیس کے گانگ کے بجنے میں ..... پھر وہ تنہا رہ جائیگی۔

شخص : تم کہاں جاؤ گے ؟

سیل رواں : سیل رواں، کبھی رکتا نہیں۔

شخص : مگر ...... لوگوں کی اس بھیڑ میں ..... اونچے فلیٹوں کے اس جنگل میں،
وہ اکیلی کیسے رہ جائیگی ! ......

سیل رواں : (بے چین سا ہو کر، کچھ دور جا کر) : ان منجمد سرد میناروں میں تنہائی کی سسکی
تیر رہی ہے ...... زندگی دور قافلوں میں سرگرداں ہے .....
ریگ زاروں میں سر پٹک رہی ہے ...... مگر تم نے کبھی دیکھنے کی کوشش
نہیں کی ...... اس اتھل پتھل میں سارے پتے جھڑ گئے .... شجر
ٹنڈ منڈ رہ گیا ... بے سایہ : اب کون جوگی اسکے نیچے آکر بیٹھے گا !

شخص : کون سے جوگی کی بات کر رہے ہو ؟ ...... تم نے اسے دیکھا ہے ؟

سیل رواں : کیا دیکھا ہے اسکی بات جانے دو، کیا دیکھ رہا ہوں - اس کی بات کیوں نہیں کرتے !

..... تمہیں بھی دیکھنا چاہیے ...... تمہیں بھی دیکھنا چاہیے .....

آؤ میرے ساتھ..... چپ چاپ دیکھتے جاؤ......

(قریب جاکر شخص کے پاس کھڑا ہوجاتا ہے) ...

منظر (ب) :

[اسٹیج پر روشنی مدھم ہوتی جاتی ہے' اور سیل رواں کے آخری جملے کیساتھ مکمل اندھیرا چھا جاتا ہے...... خاموشی اور اندھیرے میں پیانو پہ کھرج میں کوئی تین سر ایکساتھ ایک ہی وقفے سے گونجتے رہتے ہیں۔ سُروں کی گونج فضا میں تحلیل ہونے سے پہلے کچھ دیر تیرتی رہتی ہے....

کوئی پانچ سکنڈ بعد اسٹیج پر روشنی دھیرے دھیرے' نمودار ہوکر بڑھتی جاتی ہے۔ سیل رواں' شخص اور وہ درخت اور چبوترا وغیرہ اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے'..... اسٹیج کا پچھلا حصہ (ڈیپ سیٹ) نظر آتا ہے جو کسی قدیم شاندار حویلی کے اندر دوہرے دالان کا سیٹ ہے۔ دیکھ بھال سے محروم در و دیوار کے درمیان قدیم وضع کی آرائش اور فرنیچر۔ بالکل پیچھے کی دیوار سے لگی ایک اونچی پشت والی کرسی پر ایک بوڑھا شخص بالکل بے حس و حرکت بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں عصا تھامے ہے۔ عمر (۷۰) سے (۹۰) سال کچھ بھی ہوسکتی ہے........ لگتا ہے جیسے کوئی بے جان شئے ہے۔ دوسری طرف ایک در سے طوطے کا پنجرہ لٹک رہا ہے۔ جسمیں طوطا بھی گردن لٹکائے بے جان سا خاموش بیٹھا ہے۔

دائیں طرف سے دروازہ تھپ تھپانے کی آواز آتی ہے۔ چند ہی سکنڈ بعد دختر اندر آجاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ گھومتے ہوئے دالان کی ہر چیز کو بغور دیکھتا ہے۔ کرسی پر ضعیف شخص کو دیکھکر ٹھٹھک کر کھڑا ہوجاتا ہے..... بائیں جانب سے نسرین آتی ہے۔ ہاتھ میں چھاج ہے

جسمیں دال چن رہی تھی ۔ اختر کو دیکھکر چونک جاتی ہے۔ دونوں حیران سے، خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں ....

اختر شرٹ اور پینٹ پہنے ہے ۔ کوئی (۴۰) کے لگ بھگ، خوش رو آدمی ہے ۔ نسرین گھریلو لباس میں ہے، قریباً (۳۵) برس کی عمر، میک اپ کے بغیر بھی خوبصورت نظر آتی ہے ۔]

اختر : (خاموشی کو توڑتے ہوئے) : تو یہہ ...... تمہارا گھر ہے ......
(نسرین چپ رہتی ہے) .... مجھے پتہ نہیں تھا ...... نسرین.....
تمہارے گھر آنا ہے ۔

نسرین : .... تو تم یہہ گھر بھی بھول گئے ـــــــــ !؟

اختر : مگر ...... مگر نسرین ۔ باہر تو سب ہی بدل گیا ہے ...... گلی بھی ...
اتنی سی لگ رہی تھی ...... چھوٹی سی ۔

نسرین : تم بڑے آدمی بن گئے ہو اختر .....

اختر : (انکاری انداز میں ہاتھ ہلاکر، جیسے سُنی اَن سُنی کرتے) : مگر یہاں .....
گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے ؟..... خالی خالی سا کیوں لگ رہا ہے ....
.... وہ گڑبڑ ...... وہ ہنگامے .... وہ ......

نسرین : بچے بڑے ہو گئے ....

اختر : مگر وہ ہیں کہاں ؟

نسرین : اُڑ گئے .... پھر پھر .... دانہ پانی کی تلاش میں ۔

[نسرین چھاج تخت پر ایک طرف رکھکر بیٹھ جاتی ہے ۔ اختر بھی پاس ہی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے]

اختر : مینو کہاں ہے ؟

نسرین : سسرال میں ہے ۔ امریکہ میں ......

اختر : سیفو ؟

نسرین : لندن میں ..... نہیں اب شائد کہیں اور چلا گیا ہے۔

اختر : بیوی بچے ؟

نسرین : اس کے ساتھ ہیں۔

اختر : اور وہ .....

نسرین : بھیا بھی امریکہ چلے گئے تھے ..... وہ تو تمہیں یاد ہوگا۔

اختر : کیا فرق پڑتا ہے '........ یاد ہونے' نہ ہونے سے۔

نسرین : روبی اور شیریں بھی اپنے اپنے گھر چلی گئیں .....

اختر : (رک کر) .... ابّا .... نسرین امّی .... ؟

نسرین : چل بسیں .... ان کے جانیکے بعد یہ گھر اور بھی بھائیں بھائیں ہو گیا ہے ....

اختر : (اٹھکر ٹہلنے لگتا ہے) : بس .... بس وہ ہی مجھے سمجھ پائی تھیں وہ اور شیریں ..... دل سے چاہتے تھے کہ ہماری بات ....
مگر سب لوگ ....

نسرین : سب لوگ ..... (رک کر) کتنا بھرا پرا رہتا تھا یہ گھر ..... مگر امّی کے آخری وقت کوئی ڈاکٹر کو بلانے والا بھی یہاں نہیں تھا ....

[دونوں چپ رہتے ہیں - تھوڑی دیر بعد، اختر مڑکر دیوار کے سہارے کرسی پر خاموش بیٹھے ہوئے بوڑھے کو دیکھتا ہے]

..... کمال الدین کے ابا ہیں۔ ان کا بھی کوئی نہیں ہے یہاں۔
...... کمال الدین نے یہیں لاکر رکھ چھوڑا ہے۔

اختر : ______ کمال الدین ؟

نسرین : میرا شوہر

اختر : کیا کرتا ہے ؟

نسرین : ...... جوا کھیلتا ہے ...... رمی ..... اور ریس۔
اختر : روپئے ——— ؟
نسرین : جمال بھیجتا ہے .... دوبائی سے .... اس کا چھوٹا بھائی ہے۔
اختر : گھر کیسے چلتا ہے ؟
نسرین : ادھر، ساتھ والا حصہ کرائے پر دے رکھا ہے .... اور پھر گھر ؟.....
چلتا کہاں ہے ! .... وہ تو کبھی کا رُکا پڑا ہے۔
[دونوں چند سکنڈ چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں]
..... دو بچے ہیں ۔ بڑا بچہ ہے .... پبلک اسکول کے ہاسٹل میں ہے۔
چھوٹی بچی ہے۔ اسکول سے شام کو آئیگی۔
اختر : [خاموشی سے نسرین کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر بیگ میں سے دو لفافے نکالتا ہے] :
.... جمال نے یہ خط دیئے تھے، دوبائی میں ..... کمال الدین کو دینے
کے لیے .... مجھے کیا پتہ تھا ..... تمہارے گھر کا پتہ ہے۔
نسرین : [اِدھر اُدھر بے مقصد دو تین قدم چل کر] : دوبائی میں کب سے ہو ؟
اختر : کوئی ۴ سال سے .... اس سے پہلے، نائیجیریا میں تھا۔
نسرین : دوبائی میں شیریں سے ملے..!
اختر : تمہاری بہن مجھ سے ابھی تک خفا ہے ..... کہتی ہے، ہمت ہار کر بھاگ کھڑا ہوا
.... تمہیں اکیلا چھوڑ کر .... نہیں ملی مجھ سے۔
[دونوں چپ ہو جاتے ہیں ۔ یکایک عقب سے کرسی والے بوڑھے کی
گرجدار آواز آتی ہے .... جیسے سارے اسٹیج پر چھا گئی ہو۔]
آواز : ...... " ڈاکیہ آ گیا کیا ——— ؟ "
[اختر چونک سا جاتا ہے۔ مڑ کر پیچھے ضعیف آدمی کی طرف دیکھتا ہے]
نسرین : (خط اٹھا کر دیکھتے ہوئے) : ان کی فکر مت کرو .... نہ ٹھیک سے
دکھائی دیتا ہے، نہ سن سکتے ہیں۔

اختر : (اضطراری طور پر ٹہلنے لگتا ہے ۔ پھر جیسے بھدی خاموشی کو توڑنے کی کوشش میں کہتا ہے) .... جمال ..... میرے آفس میں ہی کام کرتا ہے۔

مزے میں ہے ۔

نسرین : (کچھ دور جا کر) :۔ کیا تمہیں سچ مچ پتہ نہیں تھا .... یہ خط .... کمال الدین میرا شوہر ہے ۔

اختر : نہیں ۔

نسرین : اور اگر ہوتا ———— ؟

اختر : (اٹھکر ٹہلنے لگتا ہے) : .... پتہ نہیں پھر کیا کرتا ! .....

[عقب سے ضعیف شخص کی گنجلی آواز پھر سنائی دیتی ہے]

آواز : ....۔ "آ گیا کیا ڈاکیہ ؟"

[دائیں دروازے سے کمال الدین داخل ہوتا ہے۔ جلدی میں ہے ... اختر کو دیکھکر رک جاتا ہے ۔ پینٹ اور شرٹ (یا بش شرٹ) میں ہے۔ عمر لگ بھگ وہی ہے، جو اختر کی ہے ۔]

نسرین : دو بائی سے آئے ہیں .... جمال نے خط بھیجے ہیں ....

کمال الدین : (خوش ہو کر) : جمال نے ! ...... کہاں ہیں ؟

[تخت یا تپائی پر سے لفافے اٹھا کر اوپر روشنی میں آر پار دیکھتا ہے، پہلے ایک ۔ پھر دوسرا۔ پھر غصے میں وہیں پھینک دیتا ہے، جہاں سے اٹھائے تھے ۔]

.... ہونہہ ... (جانے لگتا ہے) حرامی ..... سالا .....

(رک کر، اختر کی طرف دیکھتا ہے) .....

نسرین : اختر ..... جمال کے دوست ہیں ۔

کمال الدین : پہلے کبھی نہیں آئے ..... تم سے جان پہچان ہے ؟

نسرین : (ایک سکنڈ رک کر، ترش روئی سے) : ہاں ہے .... کبھی تھی

... مگر اس وقت مجھ سے ملنے نہیں آئے ہیں۔

کمال الدین : پتہ ہے۔ آتا ہی کون ہے یہاں .... ! اچھا سنو، ایک بج رہا ہے؛ جلدی سے اپنے بھلاگوان ہاتھوں سے کھانا نکال دو ...... کپڑے بدل کر ابھی آتا ہوں ...... (دو قدم بائیں جانب بڑھ کر پھر رک جاتا ہے؛ مڑ کر اختر کی طرف دیکھتا ہے) ..... اب آتے رہنا ....

(رک کر، جیسے یاد کرکے) مسٹر اختر۔

[کمال الدین بائیں جانب اندر چلا جاتا ہے۔ ایک سکنڈ خاموشی رہتی ہے]

نسرین : .... یہ ہے میرا شوہر

اختر : ـــــ ایک بجے ..... ؟

نسرین : ریس کو جانا ہے۔

اختر : اور جمال کے خط ....

نسرین : اسے صرف ڈرافٹ چاہیئے ...... [ٹہلنے لگتی ہے] .... اجنبی .... ہم ابھی تک اجنبی ہیں ایک دوسرے کے لیے .... اور اسی طرح رہینگے ....

اختر : ـــــ اجنبی !

نسرین : ہاں اختر ...... جیسے اب میں اور تم اجنبی ہیں .... مجھے لگتا ہے جیسے یہ بھائیں بھائیں کرتے ہوئے دالان اور زہر روز کچھ اور دور کھسک جاتے ہیں، .... ان کے بیچ زہریلی تنہائی اور پھیل جاتی ہے ...... تنہائی اور خاموشی ..... اداس خاموشی ..... ہر شئے اجنبی سی لگتی ہے...

[رک کر اختر کو دیکھتی ہے، جو کرسی والے ضعیف شخص کے قریب جاکر اسے حیران سا کھڑا دیکھ رہا ہے۔ ضعیف بے حس وحرکت خاموش بیٹھا ہے۔ نسرین قریب آجاتی ہے اور زور سے کہتی ہے]

...... بابا .... یہ جمال کے پاس سے آئے ہیں .... خط لائے ہیں۔

(چند سکنڈ خاموش رہ کر) .... بابا !

ضعیف شخص: (بغیر پلٹے) : .... ڈاکیہ آ گیا کیا ______ ؟

[اختر اور نسرین، خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں - اور ہٹ آتے ہیں]

نسرین : شروع شروع میں سب لوگ خط بھی لکھتے تھے .... جلدی جلدی .....
مگر اب کسی کے پاس وقت نہیں ہے .... اور پھر .... کسے پڑی ہے کہ
جان سکے ان کی بابا کو کتنی ضرورت ہے ؟ ..... ڈرافٹ کی نہیں، خط کی ....
..... کسی کے آنے کی اطلاع کی ....

اختر : شائد .... ان خطوں میں کسی کے آنیکی اطلاع ہو -

نسرین : کیا فرق پڑتا ہے .... اتنے برسوں سے یہی ہوتا آ رہا ہے ....
لوگ آتے ہیں، انہیں لینے ایرپورٹ یا اسٹیشن جاتے ہیں، خوش خوش.....
اور جیسے دوسرے ہی دن، انہی سڑکوں پر سے انہیں واپس چھوڑنے جانا ہوتا ہے۔
ایسا آنا، آنا نہیں ہوتا .... گھر کی ویرانی کم نہیں ہوتی، بڑھ جاتی ہے۔

اختر : یہہ ویرانی .... کبھی تمہارے شوہر نے محسوس نہیں کی ؟

نسرین : (چند سکنڈ چپ رہتی ہے، پھر جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو) : کون جانے
...... اسی سے گھبرا کر .... اس نے اپنی راہ ڈھونڈھ لی ہے -

اختر : (مضطرب سا ٹہلنے لگتا ہے) : مگر اس ویرانی .... اس بوجھل خاموشی
میں .... تو دم گھٹنے لگتا ہے .... تم کیسے ....؟
[طوطے کے پنجرے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے] .... یہہ بھی اتنا چپ
ہے ...... بولتا کیوں نہیں ؟

نسرین : پنجرے میں طوطا نہیں ہے .... جو تم دیکھ رہے ہو، کپڑے کا
...... نقلی طوطا ہے -

اختر : نقلی طوطا ______ ؟!

نسرین : کبھی اصلی طوطا بھی تھا .... چہکنے والا، باتیں کرنے والا ....

پھر میں نے سوچا ... وہ کیوں ..... وہ کیوں یہہ زہر پیتا رہے .....
سسک سسک کر مر جائیگا۔ وہ یہہ سزا کیوں بھگتے .... میں نے
اسے چھوڑ دیا ....

اختر : (رک رک کر) : .... تو پھر ..... تو پھر یہہ کپڑے کا طوطا .... ؟

نسرین : (جیسے اضطراری طور پر چیخ پڑتی ہے) : کوئی تو میرا ہم راز ہو ....
کوئی تو ہو ...... میں ابھی پاگل نہیں ہونا چاہتی ——— (رو پڑتی ہے)

منظر (ج) :

[جو منظر (ل) کا اعادہ ہے]

[دونوں چپ ہو جاتے ہیں۔ اسٹیج پر اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ ساتھ ہی پس منظر میں راگ بھیروں کا الاپ ابھرتا ہے۔ جب اسٹیج مکمل تاریکی میں ڈوب جاتا ہے تو پس منظر کا الاپ بھی اسمیں جذب ہو جاتا ہے .... اسکی بجائے اب ستار اور طبلے کی گرجدار تھاپ میں راگ حمیر میں ناچ کی گت، دُرت لے میں شروع ہو جاتی ہے۔ یہہ شیوا کے نادانتا ناچ کی گت ہے۔ اور ساتھ ہی گھنگھرو اور مردنگ کی سنگت بھی ابھرتی ہے۔ (SPOT LIGHT) روشنی کے دائرے میں ایک کم عمر لڑکا شیوا کا نادانتا (تخریبی) ناچ، ناچتا ہوا نظر آتا ہے، ناچ کی لے تیز ہوتی جاتی ہے۔ گھنگھرو کی آواز اور جھانجھ کی جھنکار سے اطراف میں پھیلے ہوئے اندھیرے میں ہیجان سا پھیلتا رہتا ہے۔

کوئی تین منٹ بعد اسٹیج پر روشنی بڑھکر ہر طرف پھیل جاتی ہے
منظر وہی ہے جو پہلے سین میں تھا۔

بائیں جانب سے نِی سا نمودار ہوتی ہے اور جلدی سے لڑکے کا ہاتھ تھام کر روک دیتی ہے۔ لڑکا جیسے نڈھال، یا بے ہوش ہوکر آہستہ آہستہ زمین پر لڑھک جاتا ہے۔ اور آخر تک بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے۔ سیل رواں

اور چبوترے والا آدمی بھی روشنی کے تیز ہو جانے پر نظر آتے ہیں۔ آدمی چبوترے پر شال اوڑھے لیٹا پڑا ہے۔ سیل رواں آہستہ آہستہ بڑھکر زمین پر گرے ہوئے ناچنے والے لڑکے کے پاس آکھڑا ہوتا ہے۔

—— نی سا، عیسائی دلہنوں کی طرح کا خوب صورت فراک نما جھالردار کرتا اور تنگ پاجامہ پہنے ہوئے ہے۔ ڈوپٹہ (یا اسکارف) بھی ہے۔ نہائت دلکش خدوخال اور آواز کی مالک ہے۔ عمر بیس کے لگ بھگ ہے]

سیل رواں : (حیران سا، سوچ میں ڈوبا ہوا) :- پہلے تانڈوا ناچ ....
اب نادانتا ناچ ؟!

نی سا : —— مگر یہ شنکر نہیں ہے ...... کوئی کم عمر لڑکا ہے ......
کس کی تباہی چاہتا ہے ؟ .... اپنی یا سارے جہاں کی ؟.......
نادانتا ناچ ؟!

سیل رواں : یہی ہے .... وہ نسل، جس سے تمہیں نبٹنا ہے، نی سا۔
[جھک کر لڑکے کی ہتیلی میں بھنچی ہوئی ایک پڑیا نکال کر پھینک دیتا ہے ..... چبوترے کی طرف، جس پر شال اوڑھے آدمی سویا پڑا ہے ..... نی سا بھی اس طرف دیکھتی ہے۔]
...... سویا ہوا ہے .... بے تعلق ...... غیر ذمہ دار....

نی سا : مگر اصل طاقت تو وہی ہے ....

سیل رواں : اسی لئے زہر پھیلتا جا رہا ہے .... ہر شاخ میں .... ہر پھول اور پتے میں۔

نی سا : (زمین پر پڑے اس لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے) :- پھول۔

سیل رواں : تم فکر نہ کرو، نی سا .... اس طاقت کو جاگنا ہی پڑے گا...
جب اکیس کے گانگ سے زمین اور آسمان لرز اٹھیں گے .... اس سے پہلے ہی وہ جاگ جائیگا .... جاگنا پڑیگا۔

نی سا : جیسے خوف زدہ سی ہو کر کہتی ہے) : اکیس کا گانگ !

سیل رواں : ڈر لگ رہا ہے ؟ ...... گا نگ سے پہلے سبھی کو ڈر لگا تھا۔ مگر ...... تم میری بہترین تخلیق ہو ...... ہر طرح سے، ہر پہلو سے ...... تم ڈرو گی نہیں، ...... ہاروگی نہیں۔ تمہاری ذہانت، تمہارے حسن کے چرچے ابھی سے عام ہو رہے ہیں ..... [نِی سا کو سینے سے لگا لیتا ہے] نِی سا ...... میری نِی سا ...... مجھے تم پر فخر ہے ......۔ اکیس کے گا نگ سے تو میں ڈرتا ہوں .... کیونکہ مجھے تم سے جدا ہو جانا پڑے گا ......

(نِی سا علیحدہ ہو کر حیران سی سیل رواں کو دیکھ رہی ہے) ..... نِی سے آگے تمہیں اگلے سا پر چھوڑ کر میں واپس پہلے سا پر آجاؤں گا۔

نِی سا : اور ...... پھر ایک نئی نِی سا کی تیاری .....

سیل رواں : مگر ...... کیا پھر یہ حسن پیدا کر سکوں گا !

نِی سا : حُسن ؟ ..... کیسا حُسن ! ...... اتنے بوجھ، اتنی الجھنیں دامن سے باندھ کر آتش فشاں کے دہانے پر چھوڑے جا رہے ہیں ....
(مضطرب سی، چند قدم پیچھے ہٹ جاتی ہے) اتنی بڑی ذمہ داری ..... پوری کر سکونگی ! (ٹہلنے لگتی ہے) ..... کیا انسان کو اسکی ذات سے ملا سکوں گی ؟ ...... کیا یہ تلاش ختم ہو جائے گی ؟ ......
یہ ڈر، ..... مایوسی، شکست کا احساس ...... یہ مائگریشن، ہجرت ...... ٹوٹ کر بکھر جانے کا خوف ...... یہ سب کیا ..... ؟

سیل رواں : (ہاتھ سے رکجانے کا اشارہ کر کے، نِی سا کی بات کاٹ کر) :۔ مجھے تو خوشی ہو رہی ہیکہ تم انسان کے مسئلوں کو جان گئی ہو نِی سا ..... تم اسے حل بھی کر لوگی۔ ہر شخص ہجوم میں تنہا رہ گیا ہے ...... اور تنہائیوں کے ہجوم میں خود کو کھو بیٹھا ہے۔ مگر ..... ہر طوفان ایک دور کا خاتمہ ہوتا ہے، .....

اور ایک دور کا آغاز ۔

نِی سا : مگر .... مگر سیل رواں یہہ قافلے .... ؟

سیل رواں : (درمیان ہیں) :- رک جائیں گے .... تمہیں روکنے پڑینگے .... صرف ریگ زاروں میں ریت کے ذروں کا سیل رواں کبھی نہیں تھمتا .... شیشہ کبھی خالی نہیں رہتا .... نئی ریت ڈالنی ہی پڑتی ہے ....

نِی سا : مگر سیل رواں .... اب ذرے تھوڑے ہی سے رہ گئے ہیں ....

سیل رواں : یہہ بھی بہت ہیں .... میری نِی سا ۔ اپنی انا اور بھروسے کو برقرار رکھو .... تم بہادر ہو .... پہاڑ تک پہنچ جاؤ گی ۔

نی سا : میں تنہا رہ جاؤں گی ۔ اتنا سب دے کر اپنی نِی سا کو اکیلا چھوڑ دو گے !

سیل رواں : تم تنہا نہیں رہو گی .... ہزاروں لاکھوں جو پہلے گئی ہیں .... اور جانے کتنی اور جو بعد میں آئینگی .... تم ان کے جھرمٹ میں رہو گی میری نِی سا .... جو تھے محور میں کوئی تنہا نہیں رہتا .... خود محور تنہا رہ جاتا ہے .... اور بس .... آؤ اب چلیں

[پس منظر میں راگ للت کا الاپ ابھرتا ہے]

.... تمہیں افق کی سرمئی کہر کے پار چھوڑ آؤں .... شفاف خلاؤں میں .... آج کی باتیں بھی ہمیشہ کی طرح گرہ سے باندھکر رکھنا

[نی سا چبوترے پر سوئے ہوئے آدمی کو دیکھتی ہے ، پھر زمین پر پڑے ہوئے لڑکے کو ، خاموش رہتی ہے ۔ اس دوران ، پس منظر میں الاپ کی بجائے اسی راگ میں ناچ کی کوئی گت ، گھنگھرو اور مردنگ کی سنگت میں ابھرتی ہے ۔ نِی سا اور سیل رواں خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں]

نِی سا : اب ہماری ملاقاتیں تھوڑی ہی سی رہ گئی ہیں .... وہاں تک چھوڑنے آنے کی ضرورت نہیں .... سیل رواں ، میں اکیلی چلی جاؤں گی

مجھ سے آنکھوں میں نمی نہیں دیکھی جاتی ...... (بائیں جانب جانے لگتی ہے) ....

سیل رواں: (جیسے اپنے آپ سے) :- اور .... وہ کہتے ہیں میں سفاک ہوں۔

[اس دوران میں اسٹیج پر روشنی کم ہونے لگتی ہے۔ للتا ناچ کی گت ہلکے سروں میں جاری رہتی ہے۔ نی سا بائیں جانب آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے، سیل رواں چبوترے کے پاس جاکر سوئے ہوئے آدمی پر کی چادر کا کونا تھام کر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے .... اندھیرا بڑھ کر سارے منظر کو ڈھانپ لیتا ہے]

طوفان
کے بعد
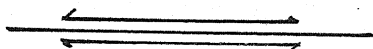
کردار : • ـــــــ انل • ـــــــ ڈاکٹر
• ـــــــ ونود • ـــــــ اسٹیشن ماسٹر
• ـــــــ اچلا • ـــــــ رامو

پہلا منظر :-

(کسی چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پہ اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ - ترتیب حسبِ منشا رکھی جا سکتی ہے - دو تین پرانی میزیں - ٹکٹ گھر کی کھڑکی ٹکٹوں کے شیلف، پرانے کاغذات اور رجسٹر دیوار سے ٹنگے ہوئے دو تین لائن کلیر (ڈبلے) ایک میز پر ایک خالی چائے کی پیالی، پرانا کالا کوٹ، ہیٹ اور مفلر وغیرہ پڑے ہیں - کھڑکی کے قریب میز پر ٹیلی گراف کا آلہ نظر آتا رہتا ہے - اسی میز پر بیضوی چمنی والا ایک پرانا سا تیل کا لیمپ جل رہا ہے -

پردہ اُٹھنے پر اسٹیشن ماسٹر کھڑکی کے پاس ایک کُرسی پر دونوں پیر اوپر اٹھائے بیٹھا نظر آتا ہے - ایک ہاتھ سے ٹیلی گراف پر ٹک ٹک کرتا رہتا ہے - ادھیڑ عمر، دھوتی اور قمیص پہنے آنکھوں پر عینک، منہ میں بیڑی دبائے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے - (اسٹیج سے باہر کچھ دُور تین بار ریل کی گھنٹی ٹن ٹن ٹن بجتی ہے - ساتھ ہی کوئی شخص رام گڑھ، رام گڑھ پکارتا ہوا تیزی سے گذر جاتا ہے - جس کے فوراً بعد انجن کی سیٹی اور ریل کے آہستہ آہستہ اسٹیشن سے روانہ ہونے کی آواز آتی ہے - جو چند سیکنڈ میں دُور ہو کر غائب ہو جاتی ہے -

دائیں طرف کے دروازے سے انل داخل ہوتا ہے - تقریباً تینتیس برس کی عمر ہے - پتلون اور شرٹ پہنے، ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس، چہرے پر تردّد اور بے چینی کے آثار)

انل : کیا آپ ہی یہاں کے اسٹیشن ماسٹر ہیں ؟

اسٹیشن ماسٹر: (پلٹ کر) جی ہاں ۔ میں ہی رام گڑھ کا اسٹیشن ماسٹر ہوں .... کہیئے۔

انل : کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں سینی ٹوریم کو کونسا راستہ جاتا ہے؟

اسٹیشن ماسٹر: ہاں .... یہ اسٹیشن کے سامنے ہی تین راستے ملتے ہیں ۔ بائیں ہاتھ کو پہلا راستہ سینی ٹوریم جاتا ہے ۔ ..... مگر کیوں ؟

انل : مجھے وہاں جانا ہے ۔

ماسٹر : کیا اس وقت ! .... آدھی رات کو ؟

انل : ہاں ۔ ابھی

ماسٹر : کیا آپ اس سے پہلے کبھی یہاں آئے ہیں ؟

انل : نہیں پہلی بار اِدھر آیا ہوں۔

ماسٹر : تبھی آپ نہیں جانتے ۔

انل : کیا نہیں جانتا ؟

ماسٹر : یہی کہ اس وقت سینی ٹوریم کو جانا ممکن نہیں ہے ۔

انل : مگر میں کسی ٹانگے وانگے میں جاؤں گا۔

ماسٹر : اس وقت اس کا انتظام نہیں ہو سکتا ۔

انل : (اٹیچی کیس میز پر رکھ دیتا ہے) دیکھئے اسٹیشن ماسٹر صاحب ۔ آپ کسی بھی طرح کسی گاڑی یا گھوڑے کا انتظام کروا دیجئے ۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا .... میرا اسی وقت جانا بہت ضروری ہے ۔

ماسٹر : آپ نہیں جانتے جناب سینی ٹوریم جس پہاڑ پر ہے وہ چاروں طرف سے بہت گھنے جنگل میں گھرا ہوا ہے ۔ اور اس جنگل میں سبھی طرح کے جنگلی جانور رہتے ہیں ۔ شام کے چھ بجے سے صبح سورج نکلنے تک کوئی اُدھر کا رُخ بھی نہیں کرتا ....

انل : مگر میں ...... مجھے بہت ضروری کام ہے .... میرا اسی وقت وہاں پہنچنا

بہت ضروری ہے ..... مہربانی سے کسی گاڑی ......

ماسٹر : (بات کاٹ کر) اس وقت آپ کو کوئی گاڑی نہیں مل سکتی - اور نہ آپ وہاں جاسکتے ہیں۔ کس بلا کی اندھیری رات ہے۔ اور پھر پورے دو میل کا راستہ اس خوفناک جنگل میں سے ہو کر جاتا ہے .... کیا آپ زندگی سے تنگ آ گئے ہیں۔

انل : (بے چین ہو کر) میں اس کے لیے بڑی سے بڑی رقم دینے کے لیے تیار ہوں ... کوئی گھوڑا ہی مل جائے ....

ماسٹر : (کرسی سے اُٹھ کر انل کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے) نہیں - یہ ناممکن ہے۔ آج تک کوئی مسافر اس ٹرین سے اُتر کر اس وقت سینی ٹوریم نہیں گیا - لوگ صبح تک یہیں ٹھہر رہتے ہیں۔ پو پھٹنے پر روانہ ہوتے ہیں۔ تب دو ایک تانگے بھی مل جاتے ہیں۔ (انل کے چہرے کو گھورتے ہوئے) آپ اس خیال کو دماغ سے نکال دیجیے اور صبح تک یہیں میرے کمرے میں ٹھہر جائیے... ..... آپ بہت تھکے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔

انل : میں بہت تھک گیا ہوں اسٹیشن ماسٹر .... بہت! پھر بھی اس وقت یہاں نہیں ٹھہر سکتا ..... ایک منٹ بھی نہیں ..... صبح تک جانے کیا ہو جائے! ......میرا جانا بہت ضروری ہے .... میں پیدل ہی چلا جاؤں گا (جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتا ہے)۔

ماسٹر : کیوں آپ اپنی جان کے دشمن بنے ہیں! ذرا سوچئے اس بلا کی اندھیری رات میں، اس خطرناک جنگل میں، اس سردی اور طوفانی ہواؤں میں آپ پیدل وہاں جاسکیں گے! .... اور پھر آپ کے پاس کوئی بندوق وغیرہ بھی تو نہیں ....!

انل : (اٹیچی کیس سنبھالتے ہوئے) : کچھ ہو .... میں یہاں نہیں رک سکتا .... آپ کا بے حد شکریہ .... اب میں چلتا ہوں .... دیر ہو رہی ہے۔ کہیں ...... کہیں بہت دیر نہ ہو جائے .... بہت دیر نہ ہو جائے .....!

[انل اسی دروازے سے باہر چلا جاتا ہے۔ پردہ گرتا ہے]

دوسرا منظر :

(سینی ٹوریم میں وارڈ کے بلاک کا ایک کمرہ - بہت تھوڑا سا سامان - دائیں اور بائیں دو دروازے

جن پر پردے پڑے ہیں سامنے کی دیوار سے لگی ہوئی ایک میز اور دو تین کرسیاں - میز پہ کچھ کتابیں، رسالے پڑے ہیں - گل دان میں کئی دن کے سوکھے ہوئے پھول ان کے علاوہ میز پر دواؤں کی خالی شیشیاں اور ڈبے وغیرہ پڑے ہیں - دائیں دیوار پر دروازے سے ہٹ کر ایک نوجوان عورت کی تصویر لگی ہے - ایک کونے میں چھوٹا سا اسٹول اور اس پر کچھ میلے کپڑے پڑے ہیں - نیچے فرش پر ایک صندوق رکھا ہے، جس کے قریب ہی دو ایک جوڑے جوتوں کے بے ترتیب پڑے ہوئے ہیں - چھت سے لگا ہوا بجلی کا بلب روشن ہے -

پردہ اٹھنے پر ونود میز پر سر رکھے کرسی پر بیٹھے بیٹھے سویا ہوا نظر آتا ہے - دائیں دروازے پہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے ایک بار، دو بار، ونود چونک کر اٹھتا ہے - کوئی پینتیس (۳۵) برس کی عمر، پریشان مضمحل چہرہ، شیو بڑھا ہوا - جسم پر دھوتی اور کرتا اور اوپر سے ایک شال لپیٹے ہوئے) -

ونود : (چپل پہنتے ہوئے) کون ہے؟ ...... کون ہے؟ ..... کون ہے اس وقت .... آدھی رات کو !

انل : (باہر سے) ذرا دروازہ کھولیے -

ونود : آ رہا ہوں .... آ رہا ہوں ...... کون ہو بھئی ؟

(دروازہ کھلتے ہی انل اندر آجاتا ہے - دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے گھورتے ہیں)

انل : میں ہوں .... انل ...... انل کمار

ونود : انل !؟ .... (چونک کر) انل ! اوہ ..... تم .... تم ہو انل !

انل : ہاں .... میں ہی ہوں -

ونود : تم نے اچھا کیا جو چلے آئے ..... بہت اچھا کیا .... (دروازہ بند کرتا ہے) مگر انل تم اس وقت ...... میرا مطلب ہے اس اندھیری رات میں ....

انل : یہ سب بعد میں ہوگا ...... آپ .... آپ ونود بابو ہیں نا ؟

ونود : ہاں میں ہی ونود ہوں ..... آؤ .... اِدھر آجاؤ ..... تم ابھی تک کھڑے ہو، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا .... ہاں اس طرف کرسی پر آرام سے بیٹھ جاؤ - لو یہ کمبل پیروں پر ڈال لو -

انل : شکریہ - باہر کس بلا کی سردی ہے ! (اٹیچی میز پر رکھ کر کمبل پیروں پر ڈال کر بیٹھ جاتا ہے)

ونود : کیا اسٹیشن سے کوئی گاڑی کر لی تھی ؟

انل : نہیں پیدل ہی چلا آیا ۔

ونود : پیدل ! اس وقت تم اسٹیشن سے اکیلے، پیدل آ رہے ہو !؟ .... جانتے ہو یہ کتنا خطرناک راستہ ہے ؟

انل : میں نے سوچا کہیں دیر نہ ہو جائے ۔

ونود : دیر ۔ ہاں تم نے اچھا ہی کیا جو چلے آئے ۔ اب تم آ گئے ہو تو مجھے اطمینان سا ہو گیا ہے ۔

انل : سارے راستے میں یہی سوچتا آیا ہوں کہ مجھے کہیں دیر نہ ہو جائے ....
ونود بابو ! دیر تو نہیں ہو گئی مجھے ؟ .... بتائیے، آپ نے لکھا تھا .... ؟

ونود : نہیں اچلا ابھی زندہ ہے ۔ دیر نہیں ہوئی ۔

انل : اوہ (رک کر) تو اچلا دیوی ابھی زندہ ہیں ۔ مگر .... وہ ہیں کہاں ؟

ونود : اس ساتھ والے کمرے میں ۔ ابھی ابھی سوئی ہے ۔

انل : (جیسے اپنے آپ سے) ابھی ابھی سوئی ہیں ۔ اچلا ..... اچلا دیوی ابھی زندہ ہیں
.... ونود بابو وہ خط اور تار آپ نے اچلا دیوی کے کہنے پر ہی بھیجے تھے نا ؟

ونود : ہاں پھر بھی مجھے ڈر تھا شاید تم نہ آؤ .... مگر اچلا کہتی تھی، نہیں تم ضرور آؤ گے
.... ضرور آؤ گے ۔

انل : (سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سلگاتا ہے) یہ تصویر ...... اچلا دیوی کی ہی ہے نا ؟
(جا کر دیوار سے لگی ہوئی تصویر دیکھتا ہے) ..... پانچ سال ! .... پانچ سال
ہو چکے مجھے اُن کو دیکھے ہوئے ۔ !

ونود : اچلا کو اب دیکھو گے تو پہچان بھی نہ سکو گے ...... یہ تصویر بیماری سے پہلے کی ہے ۔

انل : اچلا دیوی اس وقت سو رہی ہیں ۔ ونود بابو کیا میں ایک نظر ان کو دیکھ سکتا ہوں ؟ ...
بس ایک نظر !

ونود : اتنی جلدی کیا ہے ..... وہ تھوڑی دیر بعد اُٹھ بیٹھے گی ...... اور پھر ڈاکٹر نے
کہا ہے شاید کل بھی گذر جائے ۔

انل : (واپس آ کر بیٹھ جاتا ہے) شاید کل بھی گذر جائے ! .... کتنا عجیب ہے ونود بابو !

ونود : کیا ؟

انل : یہی ..... ان حالات میں، اتنے دن بعد میرا اچلا دیوی سے ملنا ..... عجیب سا لگ رہا ہے جیسے ان کے سامنے آتے ہوئے دل ڈر رہا ہے ۔ !

ونود : (پھیکی ہنسی) تم بہت ڈرپوک ہو انل ! ..... تمہارے اِس ڈر نے ہی تو سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا ۔

انل : اب اس گفت گو سے کیا حاصل ونود بابو !

ونود : ہاں ..... حاصل تو کچھ بھی نہیں ..... پھر بھی اس سے پہلے کہ تم اچلا سے ملو میں تمہیں چند باتیں بتانا چاہتا ہوں ۔

انل : ونود بابو ۔ اب میں اور آپ سب کچھ بھول ہی جائیں تو اچھا ہے ..... سب کچھ بھول جائیے ۔

ونود : یہ بھولنے والی باتیں نہیں انل ۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بھلا سکتا ۔

انل : مگر میں ...... میں تو سب کچھ بھلا چکا تھا ۔ آپ کا خط نہ ملتا تو مجھے کچھ بھی پتہ نہ چلتا .... میں تو بھول چکا تھا ..... سب کچھ بھول چکا تھا ۔

ونود : نہیں تم بھولے نہیں تھے ۔ بھول جاتے تو اس طرح دیوانہ وار چلے نہ آتے ! .... بھولا تو کوئی بھی نہیں .... کوئی بھی نہیں ! ....

انل : ونود بابو ۔ کیا اچلا دیوی نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے ..... میرے بارے میں ؟

ونود : میں نہیں جانتا وہ سب کچھ کیا ہے ۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے وہ ان پانچ برسوں میں اپنے دل کی سب سے نچلی تہوں میں تمہاری یاد دبائے جیتی رہی .... ہنستی رہی ، ہنساتی رہی .... اپنے آپ سے لڑتی رہی ۔ شائد وہ اس جنگ میں جیت بھی جاتی ۔ اپنی نئی زندگی کی نئی فضاؤں میں کھو بھی جاتی .... شاید میری محبت کے بڑھتے ہوئے سمندر میں تمہارے خیال کو ہمیشہ کے لئے ڈبو بھی دیتی ..... انل ! اس نے مجھ سے محبت کرنا سیکھ لیا تھا .... میں جانتا ہوں، وہ محبت ہی تھی ! مگر یہ بیماری اُس نے سب کچھ چھین لیا ۔ کچھ بھی نہ ہونے دیا .... سب کچھ ادھورا ہی رہا ...... !

انل : لیکن کیا اب ان کے بچنے کی کوئی صورت ..... کوئی اُمید نہیں ؟

ونود : نہیں۔

انل : مگر دنیا میں اور بھی ڈاکٹر ہیں .... اور بھی ہسپتال ہیں ! .... کیا کہیں بھی کسی قیمت پر بھی نہیں ؟

ونود : نہیں۔ کہاں کہاں پھرا ہوں ! تم نہیں جانتے۔ کتنی آرزوؤں کا خون اپنے دل میں کرنا پڑا ہے۔
...... انل ، اچلا میری بیوی ہے !

انل : میرا مطلب آپ کو دکھی کرنا نہیں تھا ونود بابو۔

ونود : میں جانتا ہوں۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ..... میں سب جانتا ہوں انل ! ......
اور پھر ہماری شادی کے بعد تو تمہیں یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ ہم لوگ کہاں ہیں ! ......
شاید کبھی معلوم بھی نہ ہونے پاتا۔

انل : تو پھر .... تو پھر مجھے کیوں بلایا ونود بابو .... مجھے نہ بلاتے تو اچھا ہی تھا۔

ونود : میں نے تمہیں اور دکھی کرنے نہیں بلایا ہے۔ انل .... تمہارا دکھ کم کرنے بلایا ہے۔ یہ بات تم بعد میں سمجھ سکو گے ...... سب کچھ تمہارے سامنے ہوجائے تو بہتر ہے۔ اور پھر اچلا کی بھی خواہش تھی کہ ایک بار تم سے مل لے۔

انل : مگر یہ سب کچھ میں برداشت نہیں کرسکتا ونود بابو .... مجھے نہ بلایا ہوتا تو اچھا تھا
...... یہ سب کچھ کیسے ہوگا !

ونود : (پلنگ پر سے اٹھ کر انل کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے) : ہمت سے کام لو انل ، میری طرف دیکھو .... ہم دونوں کی حالتوں میں ذرا ہی تو فرق ہے ..... میں تمہیں یہی بات بتانا چاہتا تھا انل۔ (آہستہ آہستہ جاکر اچلا کی تصویر کے سامنے کھڑا ہوجاتا ہے) اچلا کے ساتھ میری زندگی میں بھی محبت طلوع ہوئی تھی۔ سورج کی پہلی کرن کی طرح نرم و نازک اور پاکیزہ ...... اور پھر چڑھتے ہوئے دن کی طرح میری روح ، میری ساری کائنات اس سے جگمگا اٹھی ! (پلٹ کر واپس آجاتا ہے) میں اس سے بے پناہ محبت کرنے لگا وہ محبت کی دیوی ہے .... جو محبت وہ تم کو نہ دے سکی ، شادی کے بعد وہ اس نے میرے دامن میں لا ڈالی .... انل وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی .... ہم دونوں کی حالت ایک ہی جیسی تو ہوئی ! .... تم اسے پا ہی نہ سکے ، اور میں پاکر بھی کھو رہا ہوں !

(کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)۔

انل : (بے چینی سے اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) نہیں، نہیں ونود بابو۔ مجھے یہاں نہ آنا چاہئیے تھا۔ میں اچلا دیوی سے نہ مل سکوں گا۔ مجھے واپس چلا جانا چاہئیے ...... مجھے جانے دیجئے .... واپس جانے دیجئے! (ٹہلنے لگتا ہے)

ونود : کیا واپس جا سکو گے؟ ..... نہیں انل۔ اب تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ اس سفر کی منزل آچکی ہے۔ یہیں رہ کر ہم دونوں کو یہ غم بانٹ لینا پڑے گا ..... اکیلے برداشت نہ ہو سکے گا۔

انل : (رک کر) آخری منزل آچکی ہے۔ یہ بات کیا اچلا دیوی کو معلوم ہے؟

ونود : ہاں اس نے ایک دن ڈاکٹر کو مجبور کر کے پوچھ ہی لیا۔ اوہ! وہ دن! ..... جیسے اسے سب کچھ پہلے سے معلوم تھا۔ چپ چاپ کہیں دور خلاؤں میں بھٹکتی رہی۔ جیسے کچھ سوچنا چاہتی ہو، کچھ یاد کرنا چاہتی ہو! ..... اور پھر اُسی دن پہلی بار اُس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا ..... سب کچھ بتا دیا ......

انل : اس کی ضرورت ہی کیا تھی!

ونود : ضرورت! ..... جیسے اس کی بھٹکتی ہوئی روح کو سکون مل گیا ہو۔ اس کے دل پر سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہو ..... اس دن اُس نے مجھے ایک منٹ کے لیے بھی اپنے سے جدا نہ ہونے دیا تھا۔

انل : بس کیجئے ونود بابو ..... مجھ سے یہ سب نہیں سنا جاتا۔ (کرسی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیتا ہے)

ونود : ہمت ہار گئے انل؟ ..... جانتے ہو اس سے بھی مشکل ایک چیز ہے؟ ..... انتظار! آنے والے دن کا انتظار۔ خاموش اور مسلسل انتظار! برداشت کی ساری قوتوں کو پگھلا دینے والا انتظار! ..... میں کتنے دنوں سے اس انتظار کی آگ میں تڑپ رہا ہوں ...... اس کے تصور سے کانپ جاتا ہوں ..... بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ پھر بھی بھاگ نہیں سکتا پھر ایک بار اپنے آپ کو تیار کرتا ہوں ..... اُٹھتا ہوں، گر پڑتا ہوں ..... پھر اُٹھتا ہوں ..... ڈاکٹر کہتا ہے شاید کل بھی گذر جائے ..... شائد کل بھی گذر جائے .....

(انل کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں) ارے ..... یہ کیا انل ..... رو رہے ہو؟

انل : (روتے ہوئے) یہ .... یہ میرا نہیں، آپ کا غم ہے ونود بابو

(پردہ گرتا ہے ـــــ)

تیسرا منظر :

سینی ٹوریم کے بلاک میں اچلا کا کمرہ - بالکل ایسا ہی ہے جیسا ونود کا کمرہ - پلنگ اور میز کے زاویے بدل کر تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے - ایک چھوٹی سی میز جو اچلا کے پلنگ کے قریب ہی رکھی ہوئی ہے جس پر سفید میز پوش اور کچھ دوائیں - شیشیاں اور گھڑی رکھی ہے سامنے کی دیوار میں کھڑکی نظر آتی ہے جو بند ہے - کھڑکی اور پلنگ کے بیچ میں کچھ فاصلہ ہے -

پردہ اٹھتا ہے تو اچلا پلنگ پر سوئی ہوئی نظر آتی ہے - صبح ہو چکی ہے - کمرے میں ہلکا ہلکا اجالا ہے - جس میں اچلا کا کمزور بدن - اور الجھے ہوئے بال مدھم سے نظر آتے ہیں .... آہستہ آہستہ اچلا بیدار ہوتی ہے) -

اچلا : (کمزور آواز میں) ونود .... ونود ....

انل : (آہستہ سے بائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے) ونود بابو سو رہے ہیں ... ابھی ابھی آنکھ لگی ہے -

اچلا : (چونک کر) کون ..... تم کون ہو ؟

انل : (پلنگ کے قریب آکر) میں ہوں اچلا ...... کیا پہچان بھی نہ سکیں ؟

اچلا : (پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے) انل ! ...... انل !! اوہ تو تم آگئے !

انل : ہاں رات ہی کو آگیا تھا .... اس وقت تم سو رہی تھیں -

اچلا : آخر تم آگئے انل ! ..... میں جانتی تھی تم آؤ گے ..... ضرور آؤ گے -

انل : اچلا، یہ سب کیا ہو گیا ؟ .... یہ تم نے کیا کر ڈالا ..... !

اچلا : کچھ بھی نہیں ہوا انل ..... کچھ بھی تو نہیں ..... ڈاکٹر نے کہا ہے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا -

انل : مجھے سب معلوم ہے اچلا ..... مجھے سب معلوم ہے - سب کچھ کہاں سے ٹھیک ہو جائے گا -

اچلا : مگر میں نے تمہیں یہ سب کچھ سنانے کے لیے تو نہیں بلایا .... ذرا وہ کھڑکی تو کھول دو ..... کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں ہے ؟

(انل کھڑکی کھولتا ہے، جس کے ساتھ ہی باہر سے روشنی اندر آنے لگتی ہے)

انل : (کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس سے) باہر بادل چھا رہے ہیں۔ جانتی ہو آجکل کونسا موسم ہے؟

اچلا : جانتی ہوں ..... برسات کا! اس کھڑکی میں سے روز بادلوں کے بنتے اور بگڑتے جزیروں کو دیکھا کرتی ہوں .... اُودے اُودے بادل ...... کالے بادل .... سفید اور گلابی بادل جب یہ بادل آسمان کو ڈھانپ لیتے تو تم کہا کرتے ...... (جیسے چونک کر) مگر نہیں.... نہیں انل، کچھ بھی نہیں، وہ سب غلط ہے ...... وہ سب کیوں یاد دلا رہے ہو!... سنو دیکھو مجھے بہت پیاس لگ رہی ہے۔ دروازے کے پاس صراحی رکھی ہے۔ تھوڑا سا پانی لا دو۔

انل : (گلاس میں پانی لاتا ہے) تم زیادہ باتیں مت کرو اچلا۔ تھک جاؤ گی۔

اچلا : (گلاس لے کر) تھک جاؤں گی! ..... (پانی پیتی ہے) روز تھکنے کا انتظار کرتی ہوں مگر..... مگر تھک نہیں پاتی! ..... مگر یہ باتیں جانے دو .... مجھے اور باتیں کرنی ہیں۔ تم اتنی دُور کیوں کھڑے ہو انل؟ ..... قریب آجاؤ...... تمہیں اچھی طرح دیکھ تو لوں ....

انل : میں تو ویسا ہی ہوں .... بالکل اُسی طرح ..... لو دیکھو (پلنگ پر پاس ہی بیٹھ جاتا ہے) کچھ بھی تو نہیں ہوا مجھے!

اچلا : تمہیں کیا ہوا ہے اور کیا نہیں، یہ میں جانتی ہوں۔ تم سمجھتے ہو اتنے دنوں مجھے تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہوا؟!

انل : مجھے تو کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔

اچلا : ہوتا بھی کیسے!

انل : اچلا، میری طرف دیکھو ..... میری آنکھوں میں ...... ایک بات تم سے پوچھنا چاہتا ہوں ...... کیا .... کیا تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔

اچلا : معاف؟ .... کس لیے؟

انل : کیا تم نہیں جانتیں؟ ..... تم جانتی ہو.... تم سب کچھ جانتی ہو.... میں یہی بات پوچھنے تمہارے پاس آیا ہوں۔ ایک بار صرف ایک بار بتا دو کیا اب تم مجھ پر خفا تو نہیں ہو؟

(اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے)

کتنی بار تنہائیوں میں یہی ایک بات تم سے پوچھی ہے ... جب بھی تمہیں یاد کیا ہے، یہی ایک سوال ذہن میں اُبھر آیا ہے .... کیا اب بھی نہیں بتاؤ گی؟ ..... پانچ برس بعد آج ملی ہو .... کیا آج بھی ....؟

اچلا : انل، تم اب بھی اتنے ہی بدھو ہو ..... تمہیں کیا سمجھ آئے گی (مسکرانے کی کوشش کرتی ہے)

انل : (ٹھہر جاتا ہے) : میری بات کا جواب یہ تو نہیں اچلا!

اچلا : تم سمجھتے ہو، تمہیں معاف کرنے کے لیے میں نے یہاں بلایا ہے!

انل : (پھر آکر پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے) اچلا! ..... تو کیا سچ مچ .....؟

اچلا : میں نے تو تمہیں اسی دن معاف کر دیا تھا ..... اسی وقت ..... وہ تمہارا قصور نہیں تھا انل! ...... تم میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ دنیا سے ٹکر لے سکو ..... اپنے پتا کی مخالفت کر سکو! ..... قصور میرا تھا۔ میں نے تم سے بہت زیادہ مانگ لیا تھا .... بہت زیادہ .... وہ تمہارے بس سے باہر تھا!

انل : نہیں ..... وہ میری بھول تھی ...... میری بُزدلی تھی!

اچلا : بھول تمہاری تھی یا میری، یہ بحث کرنے کے لئے تو تم یہاں نہیں آئے ہو! سنو، میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تمہارے سامنے اپنی غلطی مان لوں ...... تم چاہے نہ مانو، مگر میں اُسے اپنی ہی غلطی سمجھوں گی .... تو پھر میری وجہ سے تم اپنی زندگی کیوں تباہ کرو! .... انل، میں جانتی ہوں، تم ابھی نہ مانو گے، مگر ایک دن میری بات ماننی ہی پڑے گی۔ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جاؤ، اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرو ..... میری طرح ..... بالکل میری طرح!

انل : یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا اچلا۔ میرے اختیار سے باہر ہے۔

اچلا : پہلے دن مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا ...... مگر پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ کچھ وقت نے اور کچھ دنوں نے، دھیرے دھیرے سب کچھ ٹھیک کر دیا۔

انل : مگر کیا یہ ایک دھوکا نہیں ہے؟ (کھڑے ہو کر ٹہلنے لگتا ہے)

اچلا : دھوکا تو وہ ہے جس میں تم اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو! ..... اب کیا ہے جس کا تمہیں انتظار ہے؟ .... جو دیکھ رہے ہو کل تک شاید وہ کبھی نہ رہے۔

انل : نہیں ..... نہیں اچلا ..... ایسا مت کہو۔

اچلا : یہی سچ ہے انل، سچ سے لڑ نہیں سکتے ..... ونود کو میں دھوکا نہیں دے رہی .... ونود دیوتا ہیں۔ ان کی داسی بن سکی یہی میرے لیے بہت کچھ ہے! ان کے لئے میرے من میں جو پریم ہے وہ تم نہیں جان سکتے!

انل : آخر ..... آخر تم کیا چاہتی ہو؟

اچلا : میں چاہتی ہوں تم زندگی سے دور بھاگنا چھوڑ دو ...... شیلا تمہیں کتنا پیار کرتی ہے، یہ جاننے کی تم نے کبھی کوشش ہی نہیں کی! ...... تمہارے انتظار میں اس نے اتنے سال گذار دیئے، کیا یہ کم ہے! .... تم اس کا ہاتھ کیوں نہیں تھام لیتے۔ کیا ...... کیا میری یہ خواہش نہیں کہ تمہاری شادی ہو، بچے ہوں ..... میں ان کو پیار سے گود میں اٹھا لوں! ..... انل، ..... انل کیا میں ......!؟

انل : (بات کاٹ کر) اچلا .... کیا سچ مچ تم یہی چاہتی ہو؟

اچلا : اس کے بغیر میری آتما کو چین نہ ملے گا انل۔ میں نے جیون میں سبھی کچھ پا لیا ہے۔ ونود سے جتنا مانگا تھا، انہوں نے اس سے زیادہ ہی دیا ..... اب آخری وقت یہ دکھ، کہ میری وجہ سے تم شادی نہیں کر رہے ہو۔ سہا نہیں جاتا! بولو ... جواب دو انل کیا تم ..... ؟

انل : (قریب آکر) اچھی بات ہے اچلا ...... اگر تم اسی میں خوش ہو تو ....

اچلا : تو تم مان گئے انل! ...... (مسکرانے کی ناکام کوشش) میں جانتی تھی ...... میں جانتی تھی تم میری بات کبھی نہ ٹالو گے ..... اور پھر یہ تو میری آخری خواہش تھی! ..... آخری ......!

انل : نہیں ..... ایسا نہیں کہتے اچلا۔

اچلا : انل تم ..... تم جلدی تو نہ چلے جاؤ گے؟ ..... میرا مطلب ہے .... میرا مطلب۔

انل : اچلا۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے ..... تم اب چپ چاپ لیٹی رہو۔ دیکھو تمہارا سانس پھول رہا ہے .... اتنی باتیں کر ڈالیں! .....

...... سُنو، شاید ونود بابو جاگ چکے ہیں (باہر کچھ آواز آتی ہے)

اچلا : تم ونود سے پہلی بار ملے ہو انل ..... کہو میرے پتی پسند آئے تمہیں؟

انل : تم نے ہی کہا تھا اچلا کہ ونود بابو دیوتا ہیں۔

(بائیں دروازے سے ونود داخل ہوتا ہے)

ونود : کسے دیوتا بنا رہے ہو انل؟ ..... مجھے؟ ..... ٹھیک ہی ہے، دیوتا بننا بہت آسان ہے .... کاش میں دیوتا ہوتا؟

اچلا : تم آگئے ونود ......؟ دیکھو! میں نہ کہتی تھی انل ضرور آئیں گے۔

ونود : مگر آنے سے پہلے انہوں نے خبر بھی نہیں کی۔

اچلا : تم نے ان کے ٹھہرنے کا انتظام بھی کر دیا ہے ونود یا جب سے سو ہی رہے تھے؟

ونود : نہیں اچلا۔ سب انتظام کر دیا ہے تم اب تیار ہو جاؤ۔ ڈاکٹر کے آنے کا وقت ہو چکا ہے۔

اچلا : ڈاکٹر تو روز ہی آتا ہے۔ آج انل آئے ہیں ...... انہوں نے میری بات مان لی ہے ونود! ...... اب ..... اب مجھے کسی بات کا ڈر نہیں، کوئی انتظار نہیں! ونود اب میں تیار ہوں .... ڈاکٹر سے کہو اب میں ......

ونود : (اچلا کی بات کاٹ کر) اچلا! انل ہمارے مہمان ہیں۔ ان کے سامنے ایسی باتیں مت کرو!

انل : ایسی باتیں نہیں سوچا کرتے اچلا دیوی۔

اچلا : ہاں۔ ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں، انل ہمارے مہمان ہیں ..... (ونود میز پر دواؤں کو ٹھیک سے رکھ رہا ہے) ...... ہمیں انل کی سیوا کرنی چاہیے میں آج اچھی ہوتی تو ان کے لیے خود رسوئی بناتی ..... تم نہیں جانتے ونود انہیں میرے ہاتھ کی گلاب جامنیں بہت پسند ہیں (پھیکی ہنسی) ..... یہ جب بھی ہمارے میاں آتے میں انہیں گلاب جامنیں ضرور کھلاتی .... مگر آج تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتی .....

کچھ بھی نہیں ! (ہاتھوں میں سر چھپا لیتی ہے)

انل : اچلا...... اچلا تمہیں یہ کیا ہو رہا ہے ! ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟

ونود : اِدھر دیکھو اچلا....... لو یہ دوا پی لو۔

اچلا : (اضطراری طور پر) کونسی دوا ؟ ..... کیسی باتیں ! ..... ونود، انل تم ......
لوگ کہاں ہو ؟ ...... اوہ ...... مجھے نظر کیوں نہیں آ رہے ! ..... یہ کمرے
میں اتنا اندھیرا کیوں ہے ؟ ..... میں نے کہا تھا وہ کھڑکی کھول دو...... وہ کھڑکی....
(اِدھر اُدھر پریشان سی ہو کر دیکھتی ہے)

انل : کھڑکی کھلی ہوئی ہے اچلا۔

اچلا : تو پھر...... تو پھر ؟ اوہ (بہ چیخ اُٹھتی ہے) ونود، کیا آج ہی...... !! تم نے تو
کہا تھا ...... ؟ ...... تم نے تو کہا تھا ...... ونود، ...... تم کہاں ہو !!

ونود : (آ کر پاس بیٹھ جاتا ہے) میں یہیں ہوں اچلا ...... یہیں، تمہارے پاس
(اچلا کے ہاتھ تھام لیتا ہے)

اچلا : میرے پاس ! ...... میرے پاس ہی رہو ونود ...... اور پاس آ جاؤ، اور !.....
جانے مجھے کیا ہو رہا ہے ...... سینے میں درد بھی بڑھ گیا ہے۔ ونود ...... مجھے
اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے ! ..... کیوں ؟!

ونود : کچھ نہیں ...... کچھ بھی تو نہیں اچلا ! ...... اب تم ذرا دیر سو جاؤ .... چپ چاپ !
...... میں تمہارا سر دبائے دیتا ہوں ..... تم بہت تھک گئی ہو (اچلا لیٹ
جاتی ہے۔ ونود سر دباتا ہے)۔

انل : (قریب آ کر) ہاں اچلا تھوڑی دیر آرام کر لو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اچلا : (آہستہ آہستہ) آرام ...... ! ..... سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا !!

ونود : نہیں نہیں ...... بولو نہیں، خاموش لیٹی رہو ..... ڈاکٹر صاحب آتے ہی ہوں گے...

(انل جا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہے)

...... پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔

چوتھا منظر :

(ڈاکٹر کے مکان کا ایک کمرہ جو بالکل ویسا ہی ہے جیسا دوسرے اور تیسرے منظر میں تھا ۔
ڈرائینگ روم کے طرز پر بہت معمولی طریقے سے سجایا ہوا ۔ بیچ میں ایک چھوٹی میز، اطراف میں کرسیاں ۔
دیواروں میں دو ایک تصویریں اور کیلنڈر ۔ میز پر گلدان اور راکھ دان ۔ پردہ اٹھتا ہے ۔ ایک کرسی پر
ڈاکٹر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے ۔ ادھیڑ عمر سے قمیص اور دھاریدار پاجامہ پہنے ہوئے ہے ۔ منہ میں پائپ،
جسے تھوڑی تھوڑی دیر میں سلگاتا رہتا ہے ۔
نوکر آکر انل کے آنے کی اطلاع دیتا ہے ..... تقریباً نوکر کے ساتھ ہی انل بھی داخل ہوتا ہے ۔ انل کا
لباس پہلے سے مختلف ہے ۔ نوکر چلا جاتا ہے) ۔

انل : نمستے

ڈاکٹر : آداب عرض ہے ...... آیئے تشریف رکھئے ۔

انل : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) : آپ نے مجھے بلایا تھا ڈاکٹر ؟

ڈاکٹر : ہاں .... آج شام کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی ۔ سوچا چائے پر آپ کو
بلا لوں ..... باتوں کا موقعہ بھی نکل آئے گا ۔

انل : اوہ شکریہ .....

ڈاکٹر : نہیں ۔ شکریہ تو آپ کا ادا کرنا ہے ۔ اتنی دور آنا پڑا آپ کو ۔

انل : میں روز ہی شام کو ادھر ٹہلتا ہوا آجاتا ہوں .... سرسبز پہاڑوں میں گھرا ہوا آپ کا یہ
سینی ٹوریم بڑی خوبصورت جگہ ہے ڈاکٹر ! جی چاہتا ہے یہیں رہ پڑوں ۔

ڈاکٹر : اوہ ..... ضرور ...... مگر مریض بن کر نہیں (دونوں ہنس پڑتے ہیں)
(نوکر ٹرے میں چائے کا سامان لا کر بیچ کی چھوٹی میز پر رکھ کر چلا جاتا ہے ۔ ڈاکٹر گفتگو
کے دوران میں آہستہ آہستہ چائے بناتا رہتا ہے ۔)

انل : ڈاکٹر ...... آج صبح آپ نے کہا تھا کہ اچلا دیوی کا تفصیلی امتحان ہو چکا ہے ......
ان کی ساری رپورٹ بھی شاید آچکی ہے ؟

ڈاکٹر: جی ہاں .... اور دراصل اسی لیے میں نے اس وقت آپ کو یہاں آنے کی تکلیف دی ہے۔

(انل بیقراری سے ڈاکٹر کو دیکھتا ہے)

انل: (بے چینی سے) تو پھر ..... تو پھر ..... تو پھر بتائیے ڈاکٹر کیا اچلا ....
کیا اچلا دیوی .... ؟!

ڈاکٹر: (چائے بنانا چھوڑ کر، انل کی طرف گھورتے ہوئے) اچلا دیوی اب خطرے سے بالکل باہر ہو چکی ہیں .... وہ بہت تیزی سے صحت مند ہوتی جا رہی ہیں۔

انل: (خوشی سے اچھل کر) ڈاکٹر۔!!

ڈاکٹر: شاید دو ایک مہینے بعد وہ گھر جانے کے قابل ہو جائیں۔

انل: گھر جا سکتی ہیں! اوہ .... ڈاکٹر، یقین نہیں آتا کہ یہ سچ ہے! مگر..... مگر یہ سب ہوا کیسے ؟!

ڈاکٹر: (پھر چائے بناتے ہوئے): انل بابو - اچلا دیوی کا کیس میری زندگی کا سب سے عجیب کیس ہے .... ایک معمہ ہے! آج سے دس دن پہلے تک دنیا کا کوئی ڈاکٹر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ بچ جائیں گی - اور میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ شاید یہی آخری دن ہو!
.... اور یہ بات میں نے ونود بابو کو بھی بتا دی تھی۔

انل: مجھے معلوم ہے .... خود اچلا دیوی بھی جانتی تھیں۔

ڈاکٹر: ایک دن مجبوراً میں نے انہیں بھی بتا دیا تھا، جو میری ایک زبردست بھول تھی۔ مگر اس کے بعد گذشتہ چند دنوں میں ان کی حالت مسلسل سنبھلتی چلی گئی۔ جو کام دوائیں نہ کر سکیں، قدرت نے کر دکھایا! .... اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔

انل: ڈاکٹر! یہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ آپ کا کمال ہے ...... آپ کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی! آپ نہیں جانتے انہیں اچھا کر کے آپ نے کتنا بڑا کام کیا ہے! کیا یہ بات ونود اور اچلا کو معلوم ہو چکی ہے؟

ڈاکٹر: نہیں، ابھی نہیں - میں نے سوچا یہ خوش خبری آپ ہی جا کر ان کو سنائیں .... اچلا دیوی کے اچھا ہونے کی سب سے بڑی وجہ شائد آپ ہی تو ہیں!

(چائے بنا کر ایک پیالی انل کے آگے بڑھا دیتا ہے - دوسری اپنے سامنے رکھ کر پینا شروع کر دیتا ہے)

انل : ہیں ؟ .... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں !

ڈاکٹر : آپ نہ آتے تو شائد یہ سب ممکن نہ ہوتا۔

انل : نہیں، نہیں ڈاکٹر۔ آپ جانتے ہیں یہ سب ونود بابو کی محنت کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اچلا کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ ایک انسان کی قوت سے باہر ہے ..... اور جو کام ان کی محنت نہ کر سکی وہ ان کی اچلا سے محبت نے کر دکھایا ہے۔

ڈاکٹر : میں جانتا ہوں انل بابو' سچ ہے ...... مگر پھر بھی .....

انل : (چائے پیتے پیتے رک کر) ڈاکٹر کیا آپ کو ونود بابو نے میرے بارے میں کچھ بتایا ہے ؟

ڈاکٹر : ہاں آپ کو تار دیتے وقت انہوں نے مجھ سے مشورہ لیا تھا .... میں بھی چاہتا تھا آپ آجائیں - میں نے سوچا شاید اچلا دیوی کی موت کا غم وہ اکیلے برداشت نہ کر سکیں ! ..... وہ ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔

انل : (جیسے اپنے آپ سے) تو آپ جانتے ہیں ..... آپ بھی سبھی کچھ جانتے ہیں۔

ڈاکٹر : نہیں - شاید میں سبھی کچھ نہیں جانتا - مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ اور اچلا دیوی ایک دوسرے کو بے حد پیار کرتے تھے اپنی زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ چکے تھے .... اور یہ بات شائد آپ کے بڑے بوڑھے بھی جانتے تھے .... مگر یہ نہیں معلوم کہ اس کے باوجود آپ کی شادی کیوں نہ ہو سکی ؟

انل : اس لئے کہ آج سے سات پشت پہلے میرے اور اچلا کے دادا ایک ہی تھے ہمارے یہاں ایسی شادی ممکن نہیں یہ بات پہلی بار اس وقت معلوم ہوئی جب ہماری شادی کی مہورت نکالی جا رہی تھی .... اوہ ! وہ پنڈت ...... !!

ڈاکٹر : مگر آپ دونوں تو پڑھے لکھے تھے ...... خود اچلا دیوی کو ان باتوں پر یقین نہ تھا۔

انل : مگر ہمارے بڑے بوڑھوں کو تھا ..... میں نے لاکھ کوشش کی۔ مگر میرے پتا یہ بات نہ جان سکے کہ دنیا میں سب سے بڑی سچائی محبت ہے ..... ہماری محبت کا یقین

اس پنڈت کے دلائے ہوئے یقین پر غالب نہ آسکا ڈاکٹر!

ڈاکٹر: مگر آپ نے اور اچلا دیوی نے عہد کیا تھا کہ چاہے کچھ ہو ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے.... کسی اور جگہ جا کر ایک نئی زندگی شروع کریں گے...... جہاں نہ جنم پتریاں ہوں گی اور نہ ان پر یقین کرنے والے........ ٹھیک ہے نا انل بابو؟

انل: (چائے ختم کر کے پیالی آگے سرکاتے ہوئے) یہ سب سچ ہے ڈاکٹر۔

ڈاکٹر: اور..... اور پھر اسی وعدے پر بھروسہ کر کے، آپ کو اپنا سب کچھ مان کے، اچلا دیوی ایک رات آپ کے پاس آئی تھیں...... اسی رات آپ دونوں کہیں چلے جانے والے تھے۔ ...... ہمیشہ کے لئے! پھر کیوں.... آپ نے ان کا ساتھ نہیں دیا انل بابو آپ نے انہیں واپس چلے جانے کا مشورہ کیوں دیا!

انل: ڈاکٹر۔ بعض کمزوریاں آدمی ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی لے کر مرتا ہے۔ مجھ میں بھی ایک کمزوری تھی..... میں اپنے پتا سے ڈرتا تھا..... بچپن سے۔ پتہ نہیں کیوں ان کے تصور سے کانپ جاتا تھا۔ اس رات بھی اپنی ساری طاقتوں کو جمع کرنے کے باوجود میں ہار گیا..... حالانکہ اس رات وہ گھر پہ موجود بھی نہ تھے! وہاں صرف اچلا تھی اور اس کی موٹر جس میں ہمیں جانا تھا۔ مگر میں جا نہ سکا! اوہ...... اس وقت کے تصوّر سے میں اب بھی کانپ جاتا ہوں.... کتنی بھیانک بھول تھی۔ کیسی خطرناک غلطی!

ڈاکٹر: آپ نے واقعی بڑی بھول کی انل بابو! اچلا دیوی شروع سے جذباتی رہی ہیں۔ آپ ان کے اٹل ارادے کو سمجھ نہ سکے...... آپ کا انکار ان کے احساسات کی توہین تھا،...... ان کی محبت کی ہار تھا۔

انل: میں انتظار کرنا چاہتا تھا ڈاکٹر...... میں سوچ رہا تھا۔ شائد وقت ہمارے بڑے بوڑھوں کو ٹھیک راستے پر لے آئے گا۔

ڈاکٹر: (پائپ میز پر خالی کرتے ہوئے) وقت! وقت کے ذرا سے پھیر سے زندگیاں بدل جاتی ہیں...... جہاز چھوٹ جاتے ہیں۔ ریلیں نکل جاتی ہیں اور....

طوفان آجاتے ہیں ! وقت صرف ایکبار آتا ہے انل بابو ! آپ شائد یہ نہیں جانتے کہ اچلا دیوی نے اپنی زندگی کا راستہ اسی رات طے کر لیا تھا۔ اسی رات گھر جا کر انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ ونود بابو سے شادی کریں گی۔ ان کے گھر والوں کی بھی یہی مرضی تھی۔ شادی تیسرے ہی دن ہو گئی۔

انل : مجھے یہ سب معلوم نہ ہو سکا تھا ڈاکٹر۔

ڈاکٹر : ہوتا بھی کیسے ! شادی ونود بابو کے گھر پر ہوئی تھی .... وہ آپ کے شہر سے بہت دور رہتے تھے .... انہیں بھی تو آپ کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا !

انل : مگر اب .... اب تو جان گئے ہیں ڈاکٹر ...... سبھی کچھ جان گئے ہیں۔

ڈاکٹر : شائد اس کی ایک وجہ میں بھی ہوں !

انل : یہ سب قدرت کے کھیل ہیں ڈاکٹر۔

ڈاکٹر : مگر یہ کھیل بڑا نازک ہے انل بابو - آپ جانتے ہیں اچلا دیوی نے ونود بابو کو آپ کے بارے میں سب کچھ کیوں بتا دیا ؟ اس لئے ...... اس لئے کہ انہیں ونود بابو سے محبت ہے .... سچی محبت ! ایک بیوی کی محبت ! پانچ سال تک چھپائے رکھنے کے باوجود وہ یہ بات ان کو بتائے بغیر مرنا نہیں چاہتی تھیں ...... کوئی بیوی ایسا نہیں چاہتی - اور یہی بات میں آج آپ کو بتانا چاہتا تھا .... اچلا دیوی ونود سے محبت کرنے لگی ہیں -!

انل : میں سمجھ گیا ڈاکٹر ..... سب کچھ سمجھ گیا - میں اچلا کے نئے جیون کی خوشیاں پھیکی نہ پڑنے دوں گا۔ وہ زندہ رہیں گی - یہی خوشی میرے لئے کیا کم ہے ! میں چلا جاؤں گا ..... بہت جلد چلا جاؤں گا۔

ڈاکٹر : (دوبارہ پائپ سلگاتے ہوئے) بہت سی پچھلی باتیں یاد دلا کر میں نے آپ کا دکھ تازہ کر دیا ہے اس لئے مجھے معاف کر دیجئے - اچلا دیوی کا کیس میری زندگی کا سب سے عجیب کیس بن گیا ہے - اسی لئے یہ سب باتیں ....

انل : (بات کاٹ کر) میں جانتا ہوں ڈاکٹر .... میں آپ کا بے حد ممنون ہوں - آپ نے میری تمام ذہنی الجھنوں کو ختم کر دیا ہے - آپ کا یہی کیا کم احسان ہے ! ..... اب میں

یکسوئی لئے جا رہا ہوں (کھڑا ہو جاتا ہے ساتھ ہی ڈاکٹر بھی) شکریہ ڈاکٹر.....

اب مجھے اجازت دیجئے۔

ڈاکٹر: خدا حافظ انل بابو...... وہ لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے..... اچھی خبریں سنانے میں دیر نہیں کیا کرتے!

(انل جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسی طرح کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھ رہا ہے پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

پانچواں منظر:-

(ونود کا کمرہ۔ ترتیب وہی ہے جو دوسرے منظر میں تھی۔ البتہ اب ہر چیز سلیقے سے سجائی ہوئی رکھی ہے۔ گلدان میں تازہ پھول ہیں۔ ایک طرف کونے میں کمرے کی دیوار سے لگی ہوئی تپائی پر چھوٹا ٹی وی سٹ رکھا ہے۔ گھڑی میں شام کے پانچ بجے ہیں۔

پردہ اٹھتا ہے تو انل ٹی۔وی سٹ کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا کوئی میگزین دیکھ رہا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ونود دائیں طرف کے دروازے سے اندر آتا ہے سلک کی شرٹ اور ٹیریلین کی پتلون پہنے ہوئے ہے۔ ہاتھ میں..... کتابیں، رسالے وغیرہ ہیں۔ جنہیں ایک طرف میز پر رکھ دیتا ہے)

انل: آ گئے ونود بابو؟...... کہاں تھے اتنی دیر تک؟

ونود: ذرا اسٹیشن تک چلا گیا تھا......... اچلا کے لئے نئی کتابیں اور میگزین لانے تھے۔

انل: تبھی اتنے لدے پھندے چلے آ رہے ہیں۔

ونود: ہاں پر یہ کیا ہے.......! (ٹی۔وی کی طرف حیرت سے دیکھنے لگتا ہے)

انل: یہ؟...... یہ ٹی۔وی ہے۔

ونود: وہ تو دیکھ رہا ہوں...... پر یہ آیا کہاں سے؟..... کون لایا اسے؟!

انل: دکان سے آیا ہے۔ میں نے منگوایا تھا...... آج ہی پہنچا ہے۔

ونود: مگر......؟

انل: (بات کاٹ کر) مگر وگر کچھ نہیں ونود بابو (میگزین بند کر کے آگے آ جاتا ہے) یہ میں نے اچلا دیوی کے لیے منگوایا ہے...... ان کی صحت کی خوشی میں!..... کئی دن سے

سوچ رہا تھا ان کے نئے جیون پانے کی خوشی میں کوئی تحفہ دوں ! .....

ونود : لیکن کیا اس کی ضرورت تھی انل ؟

انل : تحفہ تو بلا ضرورت بھی دیا جاتا ہے ونود بابو۔ اچلا دیوی کی شادی میں شریک نہ ہو سکا کیا اس خوشی میں بھی شریک نہ ہوں ! ..... اور پھر اس دور پہاڑی مقام پر ایک ٹی وی سٹ تو ہونا ہی چاہیئے۔

ونود : جب تم نے منگا ہی لیا ہے تو اب بحث سا ہے کی ؟ تم نے یہاں آکر جو احسان مجھ پر کیا ہے کیا وہ کم تھا انل جو ..... خیر میں صرف شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں۔

انل : احسان کس نے کس پر کیا ہے' یہ بات رہنے ہی دیجئے تو اچھا ہے ..... اچلا دیوی کو خطرے سے باہر نکلے کوئی دو ہفتے ہو چکے ہیں۔ کچھ دن بعد انہیں گھر جانے کی اجازت بھی مل جائے گی۔ میں نے سوچا ہے کل واپس چلا جاؤں ..... مجھے آئے ہوئے بھی بہت دن ہو چکے ہیں !

ونود : کل ؟

انل : ہاں ۔ اچلا دیوی سے بھی کہہ چکا ہوں۔

ونود : نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا ...... میں کہہ چکا ہوں انل ہم سب ساتھ ہی واپس جائیں گے۔

انل : ونود بابو ۔ میں آپ کے اصرار پر اتنے دن ٹھہر گیا .... اب اور نہیں ٹھہر سکتا ! میرا جانا بہت ضروری ہے ...... کل چلا جاؤں گا۔

ونود : نہیں ۔ یہ ناممکن ہے۔

انل : ضد نہ کیجئے ونود بابو ۔ (کرسی سے اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے ۔ ونود پلنگ پر ہی بیٹھا رہتا ہے)

ونود : انل' کیا تم نے واقعی جانے کا ارادہ کر لیا ہے ؟

انل : ہاں۔ آپ نہیں جانتے ...... مجھے پہلے ہی چلا جانا چاہیئے تھا ..... بہت پہلے !

ونود : مگر کیا اچلا نے تمہیں جانے کی اجازت دے دی ہے ؟

انل : (پلٹ کر ونود کو گھورتے ہوئے) : اجازت نہ بھی دیں تو بھی مجھے چلے جانا چاہیئے ..... میں آپ دونوں کی خاطر ہی تو جانا چاہتا ہوں !

ونود : یہ کیا کہہ رہے ہو انل !

انل : ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں ۔ کیا آپ نہیں دیکھتے اچلا آج کل کتنی اداس اور کھوئی سی رہتی ہیں؟
(پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
میں سمجھ رہا تھا وہ خوشی سے پاگل ہو اٹھیں گی ۔ بچوں کی طرح ناچنے لگیں گی !
...... نیا جیون پاکر کون خوش نہیں ہوتا ؟ مگر ... مگر اچلا دیوی خوش نہ ہو سکیں ونود بابو!

ونود : تمہارے چلے جانے سے اُنکی خوشی اور کم ہو جائے گی۔

انل : نہیں ۔ یہ نہیں ہو سکتا ...... میں آپ دونوں کے درمیان سے ہٹ جانا چاہتا ہوں ۔ میں چاہتا ہوں آپ دونوں اپنی زندگی پھر وہیں سے شروع کر دیں ، جہاں سے چھوڑی تھی ....
جیسے میں یہاں آیا ہی نہیں ! ..... مجھے بھلا دیجئے ..... سب کچھ بھلا دیجئے
.... میں کل چلا جاؤں گا ۔

(انل بے چینی سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہے ونود کا نوکر رامو بائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے)

رامو : چائے یہیں پیجئے گا یا بی بی جی کے کمرے میں رکھ آؤں ؟

ونود : یہیں لے آؤ ۔

رامو : جی اچھا (چلا جاتا ہے)

انل : (واپس آ کر میز پر سے سگریٹ کیس اور دیا سلائی کی ڈبیہ اٹھاتے ہوئے) : ونود بابو
...... میں اس وقت چائے نہیں پیوں گا ۔ جی نہیں چاہ رہا .... میں ذرا باہر گھوم آؤں ....

ونود : جیسی تمہاری مرضی ..... مگر واپس آنے میں زیادہ دیر مت کرنا ۔

(انل دائیں دروازے سے چلا جاتا ہے ۔ چند سیکنڈ بعد اچلا بائیں دروازے سے آتی ہے ۔ پہلے سے زیادہ صحت مند نظر آتی ہے ۔ بالوں میں زرد رنگ کا چھوٹا سا پھول لگا ہوا ہے ۔ چہرے پر ہلکے سے میک اپ کے باوجود پھیکا پن اور کھچاؤ نظر آتا ہے ۔)

اچلا : تم کہاں چلے گئے تھے ونود ؟ ..... کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں !

ونود : کیوں ..... کیا بات ہے ؟

اچلا : کچھ بھی نہیں ...... ایسے ہی ! تم کہیں چلے جاتے ہو تو ڈر سا لگنے لگتا ہے۔

ونود : (اٹھ کر قریب آتا ہے) :- پگلی! ...... دیکھو تمہارے لئے نئے میگزین اور کتابیں لایا ہوں۔

اچلا : او شکریہ ...... (جا کر میز پر کتابیں دیکھنے لگتی ہے) انل بابو کہاں ہیں؟

ونود : وہ ذرا گھومنے چلے گئے ہیں ...... کل وہ واپس جا رہے ہیں، کیا تمہیں معلوم ہے؟

اچلا : ہاں معلوم ہے۔

ونود : اور ہاں ...... انل نے تمہارے لئے ٹی۔ وی منگوایا ہے!

اچلا : میں یہ بھی جانتی ہوں ...... مگر انہوں نے یہ کیوں کیا' یہ نہیں جانتی!
(گھوم کر ونود کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

ونود : تمہارے اچھے ہونے کی خوشی میں .....

اچلا : نہیں - میں اسے نہیں لے سکتی - انل سے کہو اسے اپنے ساتھ لے جائیں

ونود : اچلا - یہ انل کی طرف سے تحفہ ہے اسے واپس نہیں کرتے!

اچلا : نہیں - نہیں' اسے واپس کرنا ہوگا ...... میں اسے یہاں نہیں رکھ سکتی!

ونود : کیسی باتیں کر رہی ہو! ..... انل ہمارے مہمان ہیں - ہم نے ہی انہیں یہاں بلوایا تھا۔

اچلا : وہ ایک غلطی تھی ونود ..... تم نے انہیں کیوں بلایا تھا

ونود : تم ان سے ایکبار ملنا چاہتی تھیں۔

اچلا : نہیں ...... وہ جھوٹ تھا ...... وہ ایک بھول تھی ونود!

ونود : تم ان سے کچھ باتیں کرنا چاہتی تھیں۔

اچلا : (کرسی پر بیٹھ کر) ہاں ...... میں ان کو بتانا چاہتی تھی کہ میں انہیں بھول چکی ہوں ...... بالکل بھول چکی ہوں۔

ونود : ______ مگر تم بھولی نہیں تھیں!

اچلا : ونود! میں ...... میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں ونود ...... میں تمہاری ہوں - میں ان سے یہی کہنا چاہتی تھی ...... تاکہ وہ اپنے دل سے ساری غلط فہمیاں دور کر دیں .... زندگی سے دور بھاگنا چھوڑ دیں ... تاکہ وہ شیلا سے شادی کر لیں۔

ونود : مگر انل کو تم سے محبت ہے ۔
اچلا : (چیخ کر) یہ غلط ہے ونود، یہ جھوٹ ہے .... ہماری محبت ایک دھوکا تھی !
ونود : دھوکا پانچ سال تک قائم نہیں رہتا اچلا !
اچلا : اسی لئے وہ ٹوٹ گیا ! ..... وہ ٹوٹ چکا ونود..... میں تمہاری ہوں ۔
ونود : تو پھر...... تم اتنی اداس اداس کیوں رہتی ہو ! جیسے ..... جیسے اندر ہی اندر کوئی غم تمہیں کھائے جا رہا ہو..... بتاؤ اچلا کیا بات ہے ؟
اچلا : مگر میں تو اچھی ہوتی جا رہی ہوں نا ونود !
ونود : نہیں ۔ یہ اچھا ہونا نہیں اچلا ! ..... ہر وقت خاموش، ہر وقت کھوئی کھوئی سی ..... کسی سوچ میں ڈوبی رہتی ہو ! جیسے اچھا ہونے سے ڈرتی ہو ! بتاؤ..... بتاؤ اچلا کیا تمہیں اچھا ہونے کی خوشی نہیں ۔
اچلا : میں نے ایسا تو نہیں کہا ونود !
ونود : کیا کہنے کی ضرورت ہے اچلا ؟ — میں جانتا ہوں ..... میں سب محسوس کرتا ہوں.....
اچلا : کیا ؟ ..... کیا جانتے ہو ونود ؟...... بتاؤ تم کیا محسوس کرتے ہو ؟
ونود : سنو اچلا ۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں ۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے ! .... تمہارا اور انل کا راستہ ایک ہی ہے ..... پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے ! ..... میں درمیان سے ہٹ جاؤں گا ۔ مجھے پہلے معلوم نہ تھا ..... اور پھر میں خود آیا بھی تو نہ تھا !
(اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے)
اچلا : (بھرائے ہوئے گلے سے) یہ تم کیا کہہ رہے ہو ونود !
ونود : مجھے غلط مت سمجھو اچلا ۔ میں تمہارے لئے ..... تمہاری خوشی کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں ... . بولو ..... بولو اچلا چپ کیوں ہو ؟
اچلا : ونود ——— ! (رو پڑتی ہے)
ونود : یہ کیا اچلا ؟ .... رونے لگیں !
اچلا : (روتے ہوئے) آخر تم نے کہہ ہی دیا، بس یہی مجھے ڈر تھا ..... تم مجھے سمجھ نہ سکے ....

یمی نہ سمجھ سکے !

یب آکر) تو پھر کیا بات ہے اچلا ...... کچھ تو کہو !

تم نے میری محبت کی توہین کی ہے ونود ... تم سمجھتے ہو میں انل کے لئے پریشان رہتی ہوں؟

_____ !

نے میری رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی .... میرا بھروسہ، میرا یقین .... میری اُمید،

چھین لیا .... اوہ اب میں کیا کروں ... بتاؤ اب میں کیا کروں ونود !

معاف کر دو اچلا .... میں تو تمہاری خوشی چاہتا ہوں۔

ونود۔ میں نے تم سے شادی کی تھی تو اس لئے نہیں کی تھی کہ تمہاری زندگی برباد کر دوں۔

تمہیں اپنی پاک اور سچی محبت دینا چاہتی تھی ..... ایک بیوی کی محبت ! میں تمہارے

ت میں دنیا کی ساری خوشیاں لاکر اکٹھا کر دینا چاہتی تھی ..... مگر میری بیماری نے وہ سب

نہ ہونے دیا .... سب کچھ ادھورا رہ گیا ! ...... اور جب مجھے اپنی موت کا یقین

گیا تو میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ... سب کچھ ! کیونکہ مجھے یقین تھا تم مجھے چاہتے ہو،

تنہا چاہتے ہو۔ تم مجھے معاف کر دو گے۔

میں نے تو تمہیں اب بھی معاف کر دیا ہے اچلا !

میں۔ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے .... سب کچھ ! میں اپنے آپ کو تو معاف نہیں کر سکتی!

نے تمہیں دھوکا دیا ہے .... تمہاری زندگی سے کھیلتی رہی ہوں !

سب کیا کہہ رہی ہو اچلا ! _____ تم میری ہو ... تمہیں مجھ سے محبت ہے۔

یں تمہارے دل میں کبھی وہ جگہ نہ پا سکوں گی ونود ! .... میں جانتی ہوں

.... یہ داغ کبھی دھل نہ سکے گا !

ہیں .... نہیں اچلا میں نے جو کچھ کہا تھا وہ بھول جاؤ۔

تو بھول ہی چکی تھی ونود۔ مگر اب .... اب کوئی بھول نہ سکے گا .... کوئی بھی

ہیں ! زندگی بار بار تو شروع نہیں ہو سکتی ! .... بھلا قدرت کو اس مذاق کی کیا

ضرورت تھی ! .... اوہ ! زندگی کتنی آسان ہو چلی تھی ! میں جینا چاہتی تھی ونود

.... تمہارے لئے!

ونود : تم اب زندہ رہو گی اچلا!

اچلا : (جذباتی شدت میں چیخ کر) نہیں ..... اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتی ......
مجھے مرجانے دیا ہوتا ونود! .... مجھے مرجانے دیا ہوتا!

ونود : کل انل جا رہے ہیں ..... پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اچلا : (کھڑے ہو کر) ہاں .... کل انل چلے جائیں گے ..... سب ٹھیک ہو جائے گا.....
پھر کچھ نہ رہے گا ..... کچھ بھی نہیں ..... سب ختم ہو جائے گا.....

(یہ جملے کہتے ہوئے اچلا آہستہ آہستہ بائیں دروازے سے چلی جاتی ہے ونود اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے ...... چند سکینڈ بعد رامو دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے)

رامو : ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔

ونود : (پلٹ کر) اندر ڈاکٹر صاحب .... کہاں ہیں؟

ڈاکٹر : (دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے) آداب عرض ہے ونود بابو۔

ونود : (آگے بڑھ کر) آداب عرض ہے ..... تشریف رکھیے۔

ڈاکٹر : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) اچلا دیوی کہاں ہیں؟

ونود : (رامو سے) جا کر بی بی جی کو بلا لا .... کہنا ڈاکٹر صاحب آئے ہیں (ڈاکٹر سے)
ابھی ابھی تو یہیں تھیں (رامو چلا جاتا ہے)

ڈاکٹر : انل بابو ملے تھے ..... وہ واپس چلے گئے ہیں۔

ونود : (حیرت سے) کب؟! ..... مجھ سے تو کہہ رہے تھے ....

ڈاکٹر : ہاں انہوں نے شاید آپ لوگوں کو نہیں بتایا ...... یکایک طے کر لیا اور چلے گئے...
میں اسٹیشن کی طرف سے آ رہا تھا راستہ میں مل گئے۔ میں نے سوچا آپ کو اطلاع کرتا جاؤں۔

ونود : اوہ شکریہ ڈاکٹر صاحب .... مگر انل کو ایسے تو نہ چلا جانا چاہیئے تھا ....
(بائیں دروازے کے قریب جا کر، زور سے) سُنا اچلا۔ انل بابو چلے گئے!

[اچلا بائیں دروازے سے داخل ہوتی ہے۔ قدم لڑکھڑا جاتے ہیں گرتے گرتے

قریب ہی ایک کرسی کا سہارا لے لیتی ہے]

اچلا : (الفاظ مشکل سے ادا کرتی ہے) کون چلا گیا ؟ ..... انل ؟ .... چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا!

(اچلا گر پڑتی ہے ۔ ونود اور ڈاکٹر گھبرا کر اس کے قریب آجاتے ہیں)

مگر .... مگر وہ تو کل ...... کل جا رہے تھے !

ونود : (گھبرا کر) اچلا ...... تمہیں کیا ہو رہا ہے ..... کیا کر لیا ہے تم نے ؟

ڈاکٹر : ونود بابو ۔ ان کو وہاں پلنگ پر لٹا دیجئے ......

(ونود اور ڈاکٹر کے سہارے سے اچلا پلنگ پر لیٹ جاتی ہے ۔ ڈاکٹر نبض دیکھتا ہے)

ڈاکٹر : (نبض پہ ہاتھ رکھے پریشان سا) اچلا دیوی ! .... یہ کیا کر لیا آپ نے ؟ .... بتائیے ؟

ونود : اچلا ؟ ! ..... تم ..... تمہیں کیا ہو گیا ہے اچلا ؟

اچلا : (بڑی مشکل سے کہہ پاتی ہے) مجھے معاف کر دینا ونود ...... میرے پاس آجاؤ

...... اور پاس ..... ونود !

(اچلا ایک آخری کوشش کے بعد بے حس و حرکت پڑ جاتی ہے ۔ اس کے ہاتھ سے ایک چھوٹی سی شیشی نیچے گر جاتی ہے ۔ جسے ڈاکٹر اٹھا کر دیکھتا ہے)

ڈاکٹر : آخر وہی ہوا ؟ ——— مجھے شروع ہی سے ڈر تھا !

(کرسی پر خاموش بیٹھ جاتا ہے) ۔

ونود : (چیخ کر) نہیں ! ——— نہیں ڈاکٹر اسے بچائیے ..... اسے بچائیے

ڈاکٹر ..... اچلا ! ......

(ونود اچلا سے لپٹ کر رونے لگتا ہے ۔ پس منظر میں کسی ہلکے اداس ساز کے ساتھ پردہ آہستہ آہستہ گرتا جاتا ہے ۔

.... (پردہ گر چکنے پر دور انجن کی سیٹی اور ریل کے آہستہ آہستہ روانہ ہونے کی مبہم سی آوازیں سنائی دیتی ہیں) ۔

▲▲

دوسرا
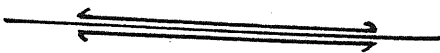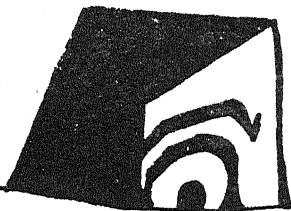
کردار :-

اروِن : چوبیس پچیس برس کا خوبرو نوجوان

آشا : خوبصورت اور معصوم خدوخال کی لڑکی

بچاری : ادھیڑ عمر، لمبا قد، مضبوط اور گٹھا ہوا جسم، سر پر لمبی لمبی جٹائیں۔

رگھو : کسرتی بدن، چہرے اور آنکھوں سے درشتی نمایاں، لمبی لمبی نوکدار مونچھیں، عمر کوئی پینتیس برس۔

ملاح : ادھیڑ عمر کا دیہاتی۔ کانوں میں بالیاں پہنے رہتا ہے۔

پاگل : کمزور جسم اور معصوم چہرے والا نوجوان۔ آنکھوں سے دحشت برستی ہے۔ سر کے بال لمبے اور بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے۔

مراری : درمیانی عمر اور کمزور جسم والا ایک بیوپاری، چہرہ سے ہوشیاری جھلکتی ہے۔

بوڑھا : گاؤں کا ایک کمزور بوڑھا۔

زمانہ :- یہی آج کل کا۔

(سیٹ کی ترتیب صرف پہلے اور دوسرے منظر میں ضروری ہے۔ تیسرا منظر دوسرے منظر کا حصہ ہے۔)

پہلا منظر

پردہ بہت آہستہ آہستہ اٹھتا ہے، اس دوران میں پس منظر سے بادوباراں کی کسی بھیانک طوفان کے صوتی اثرات سنائی دیتے ہیں، وقفہ وقفہ سے بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سنائی دیتی رہتی ہے

پردہ اٹھنے پر اسٹیج بہت مدھم روشنی میں لپٹا نظر آتا ہے، سامنے دور تک گھنے درخت اور چٹانیں پھیلی ہوئی ہیں، جن کے آگے اسٹیج پر دو ایک بڑے بڑے پتھر، جھاڑیاں اور ایک درخت کا تنا نظر آتا ہے۔ زمین پر درخت سے ٹوٹی ہوئی شاخیں اور پتے بکھرے پڑے ہیں۔

اسٹیج کے وسط میں آشا زمین پر بے حس و حرکت پڑی ہے۔ برابر ہی ارون بیٹھا ہے اور رومال سے آشا کی ایک ہتھیلی گرما رہا ہے، چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ہیں، آشا کے جسم پر معمولی قسم کی ساڑی اور چادر ہے اور ارون پتلون، قمیص اور کوٹ پہنے ہوئے ہے۔ دونوں کے کپڑے بارش اور کیچڑ میں بھرے ہوئے ہیں۔ ہاتھوں اور چہروں پر بھی کیچڑ کے دھبے نظر آ رہے ہیں۔

تھوڑی تھوڑی دیر سے بجلی کوندتی ہے تو اسٹیج کی سٹینگ لمحہ بھر کے لیے واضح طور پر نظر آ جاتی ہے لیکن پھر مدھم اجالے میں ڈوب جاتی ہے)

ارون : (آشا کو جھنجھوڑتے ہوئے) آشا ...... آشا ...... دیکھو، آنکھیں کھولو۔

آشا : (سہمی ہوئی آواز میں) :- ہوں ..... کون ؟ (آہستہ سے) ارون (چیخ کر) ارون !

(اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ خوف سے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے)

ارون : ہاں ..... ہاں ..... ڈرو مت ____ میں ہوں ..... گھبراؤ نہیں۔

آشا : تم ...... تمہیں کچھ ہوا تو نہیں ؟ ...... ارون تم ______ ؟

ارون : (آشا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) مجھے کچھ نہیں ہوا ...... نہ تمہیں کچھ ہوا ہے ..... بس ڈر گئی ہو تم ...... دیکھو تو ...... یہ میں رہا۔ اور یہ تم ..... دیکھو تو !

آشا : (چہرہ اٹھا کر ارون کو دیکھتی ہے) تو وہ گاڑی جو ......

ارون : الٹ گئی تھی۔ مگر بھگوان کا شکر ہے ہمیں کچھ نہیں ہوا۔ ہم کیچڑ میں گر پڑے تھے ..... مگر وہ بیل نہ بچ سکا۔ مر گیا بیچارہ !

آشا : میں ڈر گئی ہوں ارون ..... اف ! کس قدر خوفناک ..... کتنا ڈراؤنا۔ ! (ارون کے کاندھے پر سر رکھ دیتی ہے)

ارون : (آشا کو دلاسہ دیتے ہوئے) کچھ بھی تو نہیں۔ بارش اور اندھیرے میں گاڑی اس کھائی میں اتر گئی تھی ... مگر ہمیں چوٹ نہیں آئی۔ تم ڈر کر بے ہوش ہو گئی تھیں ..... پھر میں تمہیں یہاں اس درخت

مے نیچے لے آیا ...... بارش سے بچنے کے لیے ......

کاندھے سے سر اٹھا کر) مجھے بہت سردی لگ رہی ہے ...... اس اندھیرے میں تو کچھ نظر بھی

یں آرہا ...... اُف! کس زور کا طوفان ہے! ...... (پس منظر میں زور کی کڑک

گرج سنائی دیتی ہے (ساتھ ہی بجلی کے کوندنے پر اسٹیج ایک لمحہ کے لیے روشن ہو کر رہ جاتا ہے)

ب ہم گھاٹ کے قریب ہی ہیں ...... دیکھو، غور سے سنو۔ ندی کی آواز بھی آرہی ہے....

.. اُٹھو آشا ...... ہمت سے کام لو۔

(دونوں اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

۔ وہاں کشتی مل جائے گی؟

ل تو جائے گی ...... پر ندی چڑھاؤ پر ہوگی ...... اس اندھیری رات میں ——— !

میں، نہیں ارون، ہمیں اس پار تو پہنچنا ہی ہے .... چاہے کچھ ہو .... کسی حالت میں .... اوہ بھگوان!

قریب آکر) گھبرانے سے کام نہ چلے گا۔ آؤ ...... میرے اور پاس آجاؤ (آشا کا ہاتھ اپنے

تھ میں لے لیتا ہے) ...... تم کس قدر کانپ رہی ہو ...... ہاتھ پاؤں سرد ہوگئے

یں ...... ایسے کام نہیں چلے گا آشا!

سچ مچ میں بہت گھبرا گئی ہوں۔ جس وقت سب گھبرا جاتے ہیں مجھے ذرا بھی ڈر نہیں لگا تھا....

ر اب ...... اوہ یہ رات اتنی اندھیری کیوں ہے؟

سمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں ——— طوفان آیا ہوا ہے۔

ب کیا بجا ہوگا؟

ٹھہرو دیکھتا ہوں ...... (جیب سے دیا سلائی نکال کر سلگاتا ہے اور ہاتھ پر لگی ہوئی گھڑی میں

وقت دیکھتا ہے) نو بج چکے ہیں۔

سات بجے ہم گھر سے نکلے تھے! ...... ہمیں اب تک تو وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا! .... ندی

ر کر لینی چاہیے تھی ...... کہیں وہ لوگ ...... وہ لوگ یہاں نہ پہنچ جائیں ......

سہم کر) ارون ...... بھگوان (رونے لگتی ہے)

دیکھو آشا۔ اس طرح تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا ...... اب اتنی دور نکل آنے کے بعد ڈرنا کیسا!....

وہ لوگ یہاں نہ آسکیں گے .... اس وقت " اس طوفانی رات میں .... اب وہ ہم تک کبھی نہ پہنچ سکیں گے ..... !

آشا : اس طوفان کو بھی آج ہی آنا تھا !

ارون : جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا ...... ہم ابھی کچھ دیر میں ندی پار کرلیں گے (اسٹیج پر اجالا کچھ زیادہ ہوجاتا ہے)

آشا : ندی میں باڑھ ہو تو ..... ؟

ارون : کوئی بات نہیں، یہاں کا ملاح بہت ہوشیار اور تجربہ کار ہے ۔

آشا : اس نے انکار کردیا تو ______ ؟

ارون : میرے پاس ایک بھرا ہوا پستول موجود ہے .....

آشا : نہیں .... نہیں ارون یہ سب نہیں .... (سسکیاں لینے لگتی ہے)

ارون : آشا ! ______

آشا : (رک کر) تو پھر جلدی کرو نا ..... کہیں وہ لوگ ..... ان کے پاس بندوقیں ہیں ___!

ارون : دیکھو مجھے اس جگہ کا کچھ پتہ ہے ..... آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے البتہ گھاٹ کے پاس ہی ایک پرانا مندر ہے ...... مندر کبھی تھا۔ اب تو کھنڈر رہ گیا ہے۔ وہاں کوئی بڈھا پجاری بھی رہتا ہے اور شام کے وقت ملاح ندی کے اس طرف وہیں آجاتا ہے .... ہم بھی وہیں چلیں گے ۔

آشا : مگر مجھے بہت سردی لگ رہی ہے ۔

ارون : تم میرا کوٹ پہن لو (کوٹ اتار کر آشا کو دینا چاہتا ہے۔ آشا انکار کرتی ہے) نہیں، نہیں .... یہ نہیں ہوگا .... یہ تمہیں پہننا ہی پڑے گا ۔

آشا : اور تم ...... ؟

ارون : مجھے چھوڑو ...... تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے ..... چلو اب جلدی پہن لو .... (آشا کوٹ پہننے لگتی ہے) دیکھو، تم ابھی تک کانپ رہی ہو ...... ہاں اب ٹھیک ہے ...... یوں تو سارا کوٹ بھی بھیگا ہوا اور کیچڑ میں بھرا ہوا ہے .... مگر پھر بھی ٹھیک ہی ہے .... چلو اب میرا ہاتھ پکڑ لو .... پیچھے پیچھے چلی آؤ۔

آشا : (اسی جگہ ٹھہری رہتی ہے) مگر اس اندھیرے میں وہاں کا پتہ کیسے چلے گا ؟

ارون : وہاں ایک پرانا پیپل کا درخت ہے۔ بہت بڑا ..... تم چلی آؤ ..... مجھے سمت کا اندازہ ہے۔

آشا : (ایک قدم بڑھاکر پھر رک جاتی ہے) ارون ! جانے کیوں میرا دل اس قدر بیٹھا جارہا ہے ..... ڈر لگ رہا ہے ! کہیں بھگوان کو ہم پر غصہ تو نہیں آگیا ــــــ ؟

ارون : آشا ! ــــــ کیا اپنی محبت پر بھروسہ نہیں ؟ ــــــ پگلی کہیں کی !

آشا : شائد ہم سے کوئی گناہ ہوگیا ہے۔

ارون : گناہ ! ــــــ سنو آشا۔ ہماری محبت پر تو بھگوان کو بھی ناز ہوگا۔ وہ جانتا ہے ہم نے آج تک کیسی پاک اور سچی محبت کی ہے ! ..... اسی کے آگے اس دن ہم نے سوگند کھائی تھی ..... اور اب اسی کو پورا کرنے جارہے ہیں ...... بتاؤ آشا، کیا وہ ہماری مدد نہیں کرے گا ؟

آشا : مگر اس طرح میرا تمہارے ساتھ چلے آنا، کہیں پاپ تو نہیں ؟

ارون : بے وقوف نہ بنو آشا۔ کیا وہ ساری باتیں پھر شروع سے سمجھانی پڑیں گی ؟

آشا : (گھبرائی ہوئی آواز میں) پھر ..... پھر آج کی رات یہ بادل، یہ بارش، اتنا بڑا طوفان کیوں ــــــ ؟

ارون : یہ سب ہمارے سوچنے کی باتیں نہیں ..... سنو۔ ہم زندہ رہیں گے تو ساتھ ..... مریں گے بھی تو ساتھ ! ..... اگر آج کی رات ہمیں مرنا ہی ہے تو ..... تو کوئی بات نہیں۔ ہیر رانجھا اور سوہنی مہیوال کے ساتھ ہمارا قصہ بھی مشہور ہو جائے گا۔ (پھیکی ہنسی ہنستا ہے) چلو اپنا دل مضبوط رکھو .... سب کچھ تو ہو چکا، اب ڈر کس چیز کا ! ..... میرے پاس آؤ ..... اور پاس (آشا قریب آجاتی ہے) ہاں اب دیکھو ..... میری آنکھوں میں ....

[ارون دھیرے سے آشا کا چہرہ اوپر اٹھاتا ہے ..... دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں .... ساتھ ہی باہر بجلی کوندتی ہے اور ایک لمحہ کے لئے سارا اسٹیج روشنی میں جگمگا اٹھتا ہے ..... بادلوں کی گرج دیر تک سنائی دیتی رہتی ہے۔ آشا کا ہاتھ تھامے ارون آہستہ آہستہ

ایک طرف چلنے لگتا ہے .... پردہ گر جاتا ہے]

دوسرا منظر

ایک پرانے کھنڈر نما مندر کا بیرونی دالان دائیں بائیں بوسیدہ سے ستون، فرش پر جگہ جگہ پتھر اکھڑ چکے ہیں اور ان کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے، ریت اور کیچڑ میں بھرے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ عقبی حصے میں تین چار ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں نظر آتی ہیں۔ جن کے اوپر ڈوری سے ایک گھنٹہ آویزاں ہے جو ہوا کے تیز جھونکوں سے تھوڑی دیر میں بج اُٹھتا ہے، ایک طرف ستون کے پاس دو تین جلتی ہوئی لالٹینیں اور لاٹھیاں رکھی ہیں۔ دالان کے بیچ میں آگے کی طرف لوہے کی ایک پرانی انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے ہیں جس کے پاس پجاری اور ملاح بیٹھے ہاتھ سینک رہے ہیں۔ ان سے کچھ دور ہٹ کر عقبی سیڑھیوں کے پاس چار آدمی اور بیٹھے نظر آتے ہیں۔ یہ رگھو، مراری، پاگل اور بڑھا ہیں، پجاری نے جسم پر ایک سفید چادر لپیٹ رکھی ہے اور ملاح کے جسم پر صرف ایک دھوتی اور واسکٹ ہے۔ سر کے بال اُلجھے ہوئے ہیں۔

(پردہ اٹھنے پر بادوباراں کے وہی پچھلے صوتی اثرات پس منظر
سے پھر ابھرتے ہیں، بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج
بھی سنائی دیتی رہتی ہے باہر زور کی بارش ہو رہی ہے)

پجاری : (گرجدار آواز میں) معلوم ہوتا ہے آج کی رات طوفان آکر پھر کبھی نہ آئے گا!

ملاح : کیسی خوفناک رات ہے ــــــ ایشور تو اپنی کرپا کر۔ (بادل کی گرج زور سے سنائی دیتی ہے)

پجاری : باہر پیپل پر روحیں چیخ رہی ہیں، رو رہی ہیں..... سنو، ان کی آوازیں کیسی دردناک ہیں!

ملاح : رہنے دو پجاری، ان کا نام نہ لو....... یہ بھیانک کھنڈر ہی کیا کم ہیں!.....یہاں تو الو اور چمگادڑیں بھی نہیں رہتیں!...... اور تم نے اس کا نام مندر رکھ چھوڑا ہے ــــــ دیوی کا مندر!

پجاری : (غضبناک لہجہ میں) چپ رہ!...... بے وقوف ملاح، اس وقت بھی دیوی سے نہیں ڈرتے؟

ملاح : بس یہ آخری رات ہے۔ آج کے بعد پھر کبھی ادھر نہ آیا آؤں گا...... کہیں اور جگہ دیکھ لوں گا گھاٹ پر۔ مجھے تو اس کھنڈر کے خیال ہی سے ہول آتا ہے!.....

ندی چڑھاؤ پر نہ ہوتی تو ابھی چلا جاتا ...... مگر آج تو ..... اُف ! کیا بلا کا اندھیرا ہے ! ...... یہ آگ کیوں بجھی جا رہی ہے ؟ ..... اتنے کوئلے تو ڈال رکھے ہیں ! .... (انگیٹھی ہلا کر کوئلے درست کرتا ہے ۔)

پجاری : (عقب میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو کر، زور سے) تم لوگ بھی یہیں آگ کے پاس کیوں نہیں آ جاتے ؟ وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو ؟

بوڑھا : (وہیں سے جواب دیتا ہے) :۔ کرنے کیا، قسمت کو رو رہے ہیں ......

(بوڑھا، رگھو اور مراری اٹھ کر انگیٹھی کے اطراف بیٹھ جاتے ہیں ۔ بوڑھا دھوتی اور کھدر کا کرتا پہنے ہوئے ہے، رگھو کے جسم پر سفید دھوتی، قمیص اور کالا کوٹ ہے اور مراری کے سر پر مارواڑی وضع کی پگڑی بندھی ہے ....)

پجاری : (ایک خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے، طنز سے) :۔ قسمت کو رو رہے ہیں ! ..... (رک کر) اور وہ کون رہ گیا ہے ؟ ——— وہ کیوں نہیں آتا ....

بوڑھا : وہ پاگل ہے ۔ عجیب بے تکی باتیں کر رہا ہے !

پجاری : کیا بکتا ہے ؟

بوڑھا : کہتا ہے، کئی دن سے ایک خواب دیکھ رہا ہوں ......

پجاری : خواب ! (گرجدار ہنسی ہنستا ہے) ..... پاگل کا خواب ! ..... (باہر زور سے بادل گرجتے ہیں)

بوڑھا : وہ دیکھتا ہے جیسے ایک بہت بڑا طوفان آیا ہوا ہے، بہت ہولناک ! ہر طرف پانی ہی پانی، اندھیرا اور کیچڑ ...... اور درختوں اور پرندوں کی لاشیں ....

اوہ ! بالکل ایسا ہی ..... ایسا ہی ....

ملاح : (درمیان میں) جیسا آج رات آیا ہوا ہے ؟

بوڑھا : ہاں جیسا آج رات آیا ہوا ہے .... اور پھر اسی طوفان میں وہ اسے پکڑ کر لے جاتی ہے ....

پجاری : کون پکڑ کر لے جاتی ہے ؟

بوڑھا : ـــــــ اس کی منگیتر ! پچھلی مرتبہ جب ندی میں باڑھ آئی تھی تو وہ اس میں بہہ گئی تھی

..... تب سے وہ پاگل ـــــــ وہ اس سے پیار کرتا تھا ..... کہتا ہے اس کا

خواب سچا ہے، آج وہ اپنی منگیتر کے پاس چلا جائے گا !

(سب لوگ چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں

چند سیکنڈ یہ بھدی خاموشی رہتی ہے ۔)

رگھو : (بھاری آواز میں) میں کہتا ہوں ملّاح مان جاؤ ۔ میں تمہیں پچاس روپے دوں گا..... ۔

مجھے کسی طرح اس پار لے چلو ۔

ملّاح : اس وقت کوئی ندی کے پاس بھی نہیں جا سکتا ..... بابو جی ۔

رگھو : مگر میرا پار جانا بہت ضروری ہے .... (اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے) .... بہت ضروری

ہے ! .... نہیں تو..... اوہ ! ..... آج کی رات مجھے .....

پجاری : تم کون ہو ؟

رگھو : میں ـــــــ (رک کر) میرا نام رگھو ہے !

ملاح اور پجاری : (چونک کر) رگھو ! .... رگھو ڈاکو ؟ .....

رگھو : ہاں، میں ہی رگھو ڈاکو ہوں اور یہ دیکھو میرے پاس سو روپے کے نوٹ بھی ہیں ......

تم مجھے ندی کے اس طرف چھوڑ دو تو یہ ابھی تمہارے ہو سکتے ہیں ..... ملاح، میں تمہیں

سو روپے دے رہا ہوں ! ...... اور نہیں تو، ادھر دیکھو، میرے پاس اتنا لمبا چاقو

بھی ہے ـــــــ سمجھے ؟ (کوٹ کی جیب سے چاقو نکال کر دکھاتا ہے)

ملّاح : (سہم کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ رگھو کے پاس جا کر) :۔ مگر..... مگر بھیّا اس وقت کون مرنے کو

وہاں جائے گا ! ..... ندی کی آواز نہیں سنتے ؟ .... اور پھر یہ اندھیرا، بارش ۔

رگھو : یہ سب میں نہیں جانتا، تم ملاح ہو۔ کسی طرح لے چلو، مجھے آج رات کسی حالت اُس پار جانا ہے.. ابھی اسی وقت ۔

مرادی : (تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) ٹھہرو بھیّا جی ۔ میں بھی چلوں گا ..... دوپہر سے

کشتی کے انتظار میں یہاں بیٹھا رہا ۔ جب شام کو کشتی آئی تو یہ ملّاح کہنے لگا، ابھی اور

مسافر آجائیں، تب چلوں گا .... اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ طوفان آگیا جی ! ـــــــ

مجھے بھی بہت ضروری کام ہے جی..... میں تباہ ہو جاؤں گا..... لٹ جاؤں گا.....
مجھے لے چلو جی.....

پجاری : تم نے دیر سے شور مچا رکھا ہے، جانا ہے..... جانا ہے! یہاں سب ہی اس پار جانے کو آتے ہیں۔ گھاٹ کے اس طرف کوئی نہیں رکتا! ——— پر تمہاری طرح شور کوئی نہیں مچاتا..... آخر تم ہو کون؟

مراری : میرا نام مراری لال گردھاری لال ہے جی...... بانس پور میں کپڑے اور اناج کی دکانیں ہیں جی۔

پجاری : (تیکھی ہنسی کے ساتھ) :۔ ٹھیک ہے۔ بڑے آدمی ہو۔ تبھی وقت اتنا قیمتی ہے!

مراری : ہاں جی...... پر میں تو دوپہر سے.......

رگھو : (بات کاٹ کر، ملاح سے) :۔ بتاؤ ملاح..... تم مانو گے یا نہیں؟

ملاح : (ایک قدم پیچھے ہٹ کر) :۔ رگھو بھیا..... کیسی باتیں کر رہے ہو!..... اپنی جان پیاری نہیں تمہیں؟..... ایسا طوفان تو آج تک دھرتی پر نہ آیا ہوگا!..... (باہر زور سے بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سنائی دیتی ہے)

مراری : (طوفان سے گھبرا کر) :۔...... اوہ پرمیشور....... (انگیٹھی کے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے)

پجاری : جیسے ساری دھرتی آج پانی میں ڈوب کر رہ جائے گی۔ جو کچھ بچے گا اسے یہ بجلیاں گر کر جلا دیں گی.......... کتنا بھیانک ہے!........ اور یہ پیپل کی روحیں!
...... ان کی چیخیں نہیں سنتے؟

رگھو : میں ان سے نہیں ڈرتا،

پجاری : دیوی سے بھی نہیں ڈرتے؟ ——— آج ندی کی دیوی سخت غصے میں ہے۔ اس کا ایسا غصہ پہلے کبھی نہیں دیکھا میں نے!...... دیوی، ہم پر دیا کر۔

(رگھو اور ملاح بھی آ کر انگیٹھی کے گرد اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے ہیں، پس منظر میں بارش اور ہواؤں کی آوازیں ابھر جاتی ہیں ساتھ ہی اسٹیج کے باہر بائیں جانب سے کسی کے قریب آتے

ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں ... سب لوگ
پلٹ کر اس طرف دیکھنے لگتے ہیں، پجاری جسم پر چادر لپیٹے
اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

پجاری : (بائیں طرف دیکھتے ہوئے) :۔ یہ کون آ رہا ہے؟ ... اس وقت اس طوفان میں .....؟

بوڑھا : شائد ..... پیپل کی روحیں .....

پجاری : (غصے سے) خاموش رہو ———— !

(آوازیں بہت قریب آ جاتی ہیں۔ بائیں طرف سے ارون
اور آشا داخل ہوتے ہیں، آشا کے کاندھوں پر ارون کا
کوٹ ہے، دونوں کے کپڑے بارش میں بھیگے ہوئے ہیں۔
اندر آ کر ارون اور آشا کپڑے جھاڑتے ہوئے دور ہی کھڑے
رہتے ہیں۔)

ارون : شکر ہے ..... ہم یہاں تک تو پہنچ گئے !

پجاری : دیوی کا شکر ادا کرو ..... اس مندر کی دیوی کا !

ارون : تم ..... تم یہاں کے پجاری ہو؟

پجاری : ہاں، مگر تم کون ہو؟ ———— اس وقت ..... اس اندھیرے اور ...... !

ارون : (بات کاٹ کر) :۔ ہمیں ندی کے پار جانا ہے۔ راستے میں ہماری گاڑی الٹ گئی تھی
...... بارش اور اندھیرے کی وجہ سے۔ مگر ہمیں کوئی چوٹ نہیں آئی ....
میرا نام ارون ہے ...... یہ آشا ہیں۔

رگھو : یہاں آگ کے پاس آ جاؤ۔

آشا : (ہولے سے) :۔ نہیں ارون یہیں رہو۔ ان لوگوں سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کیسی
خوفناک شکلیں ہیں! جیسے شمشان میں چتا کے گرد بھوت بیٹھے ہیں!

پجاری : (ایک گرجدار قہقہہ لگاتا ہوا آگے بڑھتا ہے) :۔ تم بہت تیز معلوم ہوتی ہو لڑکی ..... مگر
اس اندھیرے میں کہاں جا سکو گی! ———— رات یہیں کاٹنی پڑے گی .....

قسمت والی ہو جو یہاں تک پہنچ بھی گئیں !

آشا : نہیں، نہیں ..... ہمیں اسی وقت جانا ہے۔

اروِن : (آگے بڑھ کر) تم میں ملّاح کون ہے ؟

ملّاح : کیوں کیا ہے ؟ ——— کیا تم بھی اس طوفان میں پار جانے کے لیے بے چین ہو ؟ ..... کیا آج سارے مسافر ایسے ہی آئیں گے ؟ ..... کسی کو اپنی جان پیاری نہیں ؟ ——— نہ ہو۔ مجھے تو ہے ..... میں بتائے دیتا ہوں، اس طوفان میں اپنی کشتی ہرگز دریا میں نہیں ڈالوں گا ..... چاہو مجھے مار ڈالو .....

میری جان لے لو۔

رگھو : (چیخ کر) :- میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا ...... (اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

مراری : (گھبرا کر) ہیں، ہیں ..... کیا کرتے ہو جی رگھو جی مہاراج ! اسی کو مار ڈال دیا ر کیسے پہنچو گے ؟

پجاری : (قریب آکر) خبردار، یہ دیوی کا استھان ہے ! ..... یہاں ایسی باتیں نہیں ہوں گی۔

رگھو : (ہنستا ہے) :- دیوی کا استھان ! ..... اور تم اس کے رکھوالے ہو ..... (ہنس کر ٹہلنے لگتا ہے) ..... میں جانتا ہوں ...... میں سب کچھ جانتا ہوں پجاری مہاراج ! ..... میں رگھو ڈاکو ہوں !

مراری : (آشا سے) تم آگ کے پاس آجاؤ ..... وہاں سردی میں کانپ رہی ہو .....
اور تم بھی آجاؤ نا ؟ ..... کیا نام ہے جی تمہارا ؟ ..... اروِن (ہنستا ہے) .....
بڑا پیارا نام ہے جی ..... جوڑی بھی بہت پیاری ہے۔ (پھر ہنستا ہے)

اروِن : (ملّاح کے پاس آکر) :- تو تم نہیں چلو گے ملّاح ؟

ملّاح : (سر ہلا کر) :- نہیں۔

اروِن : میں گھاٹ پر سے تمہاری کشتی کھول کر لے جاؤں گا۔

رگھو : (ٹہلتے ٹہلتے رک جاتا ہے) کون کھول لے جائے گا کشتی ؟ ——— مجھے نہیں جانتے ؟
——— میرا نام رگھو ہے ...... رگھو ڈاکو !

آشا : (سہم کر اروِن کے پاس آجاتی ہے) :- اروِن یہاں سے چلو ..... کہیں بھی ..... کہیں اور چل کر بیٹھیں گے۔

پجاری : تم اس وقت کہاں جا سکوگی ؟ ـــــ اس طرف اندر میرا بستر پڑا ہے .... جاؤ آرام سے سو رہو۔ صبح چلی جانا۔ تمہارا پتی ہمارے ساتھ رہے گا .... ڈرو مت .... ہم سب مسافر ہیں .... سب ہی کو پار جانا ہے۔ یہاں کچھ نہ ہوگا ! ...... یہ دیوی کا استھان ہے .... ! (ہنسنے لگتا ہے)

(پجاری اور رگھو پھر انگیٹھی کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ رگھو جیب سے سگرٹ نکال کر انگیٹھی کے انگاروں سے سلگاتا ہے۔)

آشا : ارون .... چلو ارون۔ میں پاگل ہو جاؤں گی .... کیسا خوفناک کھنڈر ہے .... ہر طرف لاشیں ہی لاشیں کھڑی نظر آتی ہیں ..... اور ادھر .... ادھر درختوں پر ان کی روحیں لٹک رہی ہیں .... (باہر زور سے بجلی کڑکتی ہے) .... میں مر جاؤں گی ارون ..... پاگل ہو جاؤں گی ....

ارون : (آشا کا ہاتھ تھام کر) :۔ آشا ! ہمّت سے کام لو' میں تمہارے ساتھ ہوں ....

(عقب سے پاگل اٹھ کر آتا ہے۔ جواب تک سیڑھیوں کے پاس خاموش بیٹھا تھا)

پاگل : (نیم برہنہ حالت میں' قریب آتے ہوئے) :۔ کون مر جائے گا ؟ .... کون پاگل ہو جائے گا ؟ ...... کوئی نہیں مر سکتا ..... میں' صرف میں اس کے ساتھ جاؤں گا .... سب مجھے پاگل کہتے ہیں (قہقہہ) ..... میں پاگل سہی۔ مگر وہ مجھے لینے آئی ہے ... . آج میں اس کے پاس پہنچ جاؤں گا ...... دیکھو ... وہ دیکھو مجھے بلا رہی ہے !

آشا : (چیخ پڑتی ہے) :۔ ارون ـــــ !

پاگل : یہ کون چیخا ؟ ـــــ نہیں یہ اس کی چیخ نہیں' وہ ایسے نہیں چیختی ..... وہ تو ندی پر کھڑی مجھے بلا رہی ہے ! ..... میں نے کہا تھا نا' میرا خواب سچّا ہے ! .... میں نے جھوٹ کبھی نہیں کہا ..... کبھی نہیں۔ آج کا طوفان کبھی ختم نہ ہوگا ..... کبھی نہیں ! (بادل کی گرج سنائی دیتی ہے)

پجاری : آج ندی کی دیوی بہت غصّے میں ہے۔ اس کا غصہ خطرناک ہوتا جا رہا ہے ....

پاگل : (وحشت ناک قہقہہ) :۔ خطرناک ! .... اس دن بھی خطرناک ہو گیا تھا جب ....

جب (لہجہ بدل کر) وہ اسے بہالے گئی تھی! .... وہ خون کی پیاسی ہے ..... اسے خون چاہیئے ...... انسان کا خون! (قہقہہ)

(پاگل دائیں طرف سترن کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔)

پجاری : یہ ٹھیک کہتا ہے۔ دیوی کا غصہ انسانی خون سے ہی ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے ورنہ وہ سب کو تباہ کر دے گی ...... سب مٹ جائیں گے ...... سب مر جائیں گے ...... سب! (بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج زور سے سنائی دیتی ہے)

ملاح : ندی کی آواز بڑھتی جا رہی ہے۔

پجاری : ہم میں سے ضرور کسی نے دیوی کو ناراض کیا ہے! ..... آج کے مسافروں میں سے کوئی نہ کوئی اس طوفان کا سبب ہے! ...... یہ طوفان کبھی نہ تھمے گا ......!

رگھو : تم کیا کہنا چاہتے ہو پجاری؟

پجاری : رگھو، تم ڈاکو ہو۔ تم مرنے سے نہیں ڈرو گے! ..... مگر دوسرے ڈر جائیں گے ..... موت سے سب ہی ڈرتے ہیں ...... پر آج ہم میں سے کسی ایک کو مرنا پڑے گا.. ..... کسی ایک کو!

پاگل : (ہنستے ہوئے) کسی ایک کو مرنا پڑے گا ..... کسی ایک کو مرنا پڑے گا! (پھر ہنستا ہے)

مراری : (سہم کر) نہیں، نہیں ..... میں مرنا نہیں چاہتا

رگھو : مگر کسی ایک کو مرنا کیوں پڑے گا؟

بوڑھا : ——— دیوی کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے۔

پجاری : ہاں، دیوی کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ..... جس نے اسے ناراض کیا ہے دیوی اسی کا بلیدان مانگتی ہے ..... اس کے مندر میں کھڑے ہو کر ایسی باتیں نہیں کرتے! ...... اس سے ڈرنا چاہیئے ...... ہم سب پاپی ہیں .... سب پاپی ہیں

ارون : (بے چین ہو کر) سنو ملاح، تم اب بھی نہیں آؤ گے تو میں تمہاری کشتی کھول لے جاتا ہوں...

آشا : چلو ارون ..... یہاں سے چلیں .....

مراری اور بوڑھا: (ایک ساتھ گھبرا کر) :۔ نہیں، نہیں .....

رگھو : یہاں سے کوئی نہ ہلے گا۔

پجاری : (کھڑا ہو جاتا ہے) :۔ بتاؤ...... تمہاری شادی کو کتنے دن ہوئے؟

اردن : ابھی ہماری شادی نہیں ہوئی۔

پجاری : (چونک کر) کیا کہا؟ ——— تمہارا بیاہ نہیں ہوا؟

رگھو : (کھڑا ہو کر) :۔ ہونہہ...... تو پھر... تو پھر...... !

پاگل : (درمیان میں چیخ اٹھتا ہے) :۔ بھاگ جاؤ۔ اس ندی سے دور بھاگ جاؤ...
.... ورنہ تمہارا بیاہ نہ ہو سکے گا....... بیاہ! (ہنسنے لگتا ہے)

پجاری : (ٹہلتے ہوئے) تو تم لوگ گھر سے بھاگ آئے ہو.... تم اسے بھگا کر لیے جا رہے ہو...!

اردن : تمہیں ہم سے مطلب ——— ؟

رگھو : (آگے بڑھ کر، ہنستے ہوئے) کام تو بہادری کا کیا ہے۔ مگر... مگر ایسا کیوں کیا؟

آشا : وہ لوگ مجھے بیچ ڈالنا چاہتے تھے...... روپے کے لالچ میں

اردن : آشا کا بیاہ مجھ سے نہیں کرنا چاہتے تھے۔

پجاری : (اردن کے سامنے آکر رک جاتا ہے) تم نے پاپ کیا ہے۔

اردن : ہرگز نہیں۔

پجاری : اس کا فیصلہ دیوی کرے گی۔ کون پاپی ہے، دیوی جانتی ہے.... یہاں کئی مسافر ہیں۔ سب ندی پار جانے کے لیے بے چین ہیں!...... کون کیوں جانا چاہتا ہے دیوی ہی جانتی ہے..... کس کے دل میں کیا ہے، اور کون کیا کر کے آرہا ہے..... ! یہ دیوی کی شانتی کسی نے چھین لی ہے۔ اس کا غصہ ٹھنڈا کرنا ضروری ہے..... جو پاپی ہے دیوی اسی کا بلیدان لے گی........ جبھی یہ طوفان تھمے گا اور..... اور کشتی پار ہو سکے گی...... ورنہ یہ خوفناک رات کبھی ختم نہ ہوگی!.... باہر پیپل پر مُردوں کی روحیں بے چینی سے انتظار کر رہی ہیں...... وہ ناچ رہی ہیں، بلا رہی ہیں.... ایک نئے ساتھی کو، ایک نئی روح کو...... بتاؤ تمہیں میری تجویز منظور ہے۔

رگھو : کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ بتاؤ کون..... کون کرتا ہے انکار؟ (سب کی طرف

باری باری سے دیکھتا ہے) .... طوفان کو کسی نہ کسی طرح رکنا ہے .... مجھے اس پار جانا ہے ...... آج کی رات گزرنے سے پہلے .... !

پجاری : تو سنو ۔ سامنے مندر کے کھنڈروں کے سرے پر جو پیپل کا پرانا پیڑ ہے، ہم میں سے ہر ایک کو باری باری وہاں جاکر آنا پڑے گا ــــــ دیوی جس کا بلیدان لینا چاہتی ہے، اس کو بلا لے گی ۔ اور پھر ..... یہ طوفان تھم جائے گا ! .... سب تیار ہیں ؟

رگھو : تیار ہونا ہی پڑے گا (جیب سے چاقو نکال لیتا ہے)

پجاری : ــــــ اچھا تو سب سے پہلے میں ہی جاکر آتا ہوں ! ..... ہم سب پاپی ہیں ..... کوئی نہیں جانتا کس کا پاپ بڑا ہے ! ..... کون جانے آج کی رات کسے ختم ہونا ہے ! .... اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو ..... بھگوان معاف کردے گا .... وہ معاف کردے گا ..... وہ معاف کردے گا .....

(جسم پر چادر اچھی طرح لپیٹ کر پجاری آخری جملہ دہراتے ہوئے بائیں طرف سے باہر چلا جاتا ہے، باہر زور سے بادل گرج پڑتے ہیں ــــــ اسٹیج پر سب لوگ ایک دوسرے کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں ــــــ رگھو ہاتھ میں چاقو لیے ٹہلتا رہتا ہے ۔ کوئی آدھے منٹ کے بعد پجاری واپس آتا ہے)

پجاری : (چادر سے بارش کے قطرے جھاڑتے ہوئے) :۔ میں نے کہا تھا نا ' دیوی کو میرے شریر کی ضرورت نہیں ۔ اب کوئی دوسرا جائے ۔ کہو کون جائے گا ؟ .... تم، رگھو، تم جاؤ ۔ تمہیں تو دیوی اور مجھ پر بھی وشواس نہیں !

رگھو : (چاقو بند کرکے جیب میں رکھتے ہوئے) :۔ تم سمجھتے ہو میں ڈر گیا ؟ .... وشواس تو مجھے اب بھی نہیں .... پر میں ہی جاؤں گا ..... میں ہی جاتا ہوں .... !
(بائیں طرف سے باہر چلا جاتا ہے)

آشا : اردن - یہ ہم کہاں آ گئے ! یہ کیسے لوگ ہیں ! ...... میری عقل بیکار ہو گئی ہے اردن ...... اردن (رونے لگتی ہے)

اردن : رو نہیں آشا - دھیرج سے کام لو ..... میں تمہارے ساتھ ہوں، شائد بھگوان کی یہی مرضی ہو !

آشا : میں نے کہا تھا نا ...... ہم سے ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہے -

پاگل : (قہقہہ لگا کر) :- غلطی ! ...... تم دونوں پریمی ہو ..... پریمی ! مگر میں تو آج اس سے ملنے جا رہا ہوں ..... آج ہی ..... ابھی ......

(رگھو واپس آتا ہے - کوٹ پر بارش کے قطرے نظر آ رہے ہیں)

پجاری : دیوی کو رگھو کی بھی ضرورت نہیں ہے ! ..... اب کون جائے گا ؟ ...... تم مراری لال اب تم جاؤ گے -

مراری : (بیٹھا رہتا ہے) اجی پجاری مہاراج، ...... مجھ پر دیا کیجئے ...... میری ضرورت بھلا دیوی کو کیا ہو گی !

رگھو : (غصے میں) نہیں - تمہیں جانا پڑے گا ..... سب ہی کو جانا پڑے گا -

پجاری : کون کتنا پاپی ہے ..... یہ تو دیوی ہی جانتی ہے -

مراری : (گڑگڑاتے ہوئے) :- مگر میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جی ..... گھر والی ہے جی ...... پجاری مہاراج ......

رگھو : (آگے بڑھ کر) :- مراری لال ! ..... دیر مت کرو - سمے بیتا جا رہا ہے ......

مراری : (ادھر اُدھر دیکھ کر گھبراتے ہوئے اٹھتا ہے) ...... پرمیشور ..... میری رکشا کرنا ...

(بائیں طرف سے جھجکتا ہوا باہر نکل جاتا ہے ..... بارش اور ہواؤں کی آوازیں برابر سنائی دیتی رہتی ہیں ..... مراری جلدی ہی واپس آ کر ہانپتا ہوا انگیٹھی کے پاس بیٹھ جاتا ہے)

پجاری : (قہقہہ لگا کر) :- دیوی کو تم جیسے ڈرپوک آدمیوں کی ضرورت نہیں ! ...... (پلٹ کر بوڑھے کی طرف دیکھتا ہے) ...... تم ..... اب تم جاؤ گے -

زھا : (کھڑا ہو کر) ہاں اب میں ہی جاؤں گا...... کون جانے دیوی کو میرے بوڑھے شریر کی ہی ضرورت ہو۔

(بوڑھا بھی اسی سمت سے باہر چلا جاتا ہے، ساتھ ہی پاگل جو اب تک دائیں طرف ستون سے لگا بیٹھا تھا، اٹھ کر قریب آ جاتا ہے۔)

گل : .... دیوی کو میری ضرورت ہے ....

ماری : نہیں، تم نہیں جاؤ گے۔ تم پاگل ہو........ دیوی تمہارا بلیدان نہیں لے گی۔

گل : (زور سے ہنستا ہے) :- ہاں ! میں پاگل ہوں ...... میری ضرورت کسی کو نہیں! .... پر میری دیوی کو تو ہے۔

(جا کر پھر دائیں ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہے، ساتھ ہی بائیں طرف سے بوڑھا واپس آ کر چپ چاپ انگیٹھی کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔)

ماری : ہم میں سے ہر ایک باری باری اس پیپل تک ہو آیا ہے، مگر دیوی نے کسی کا بلیدان قبول نہیں کیا........ (بیچ میں پاگل زور زور سے ہنس پڑتا ہے) اب صرف یہ نوجوان اور لڑکی بچ گئے ہیں .... ملاح کو نہیں بھیجا جا سکتا...... اس کی ضرورت ہم سب کو ہے !....... (دونوں کی طرف مڑ کر) ..... بتاؤ تم میں سے پہلے کون جائے گا ؟

شا : (ہٹ کے ساتھ) :- میں اور ارون ساتھ ہی جائیں گے۔ ہم نے بھگوان کے سامنے سوگند کھائی تھی کہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے .... ہم نے اپنے آپ کو پتی پتنی مان لیا ہے .... ہم غیر نہیں ہیں !

ماری : (ہنس کر) بھگوان کے سامنے ..... ! لڑکی، یہ مت سمجھو کہ گھر سے بھاگ آئی ہو.. ..... ابھی تم ندی کے اِس پار ہی ہو۔ ابھی تم کہیں نہیں گئیں .... (ہنستا ہے) کہیں نہیں ..... جاؤ ! تم اندر بستر پر آرام سے سو رہو ......

ارون : (غصے سے) بکواس بند کرو، ہم جا رہے ہیں ..... ہم ساتھ ہی جائیں گے۔

پجاری : اچھی بات ہے۔

پاگل : ہم ساتھ ہی جائیں گے ——— (زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

(ارون اور آشا ساتھ ساتھ بائیں طرف باہر چلے جاتے ہیں
اسٹیج پر سب لوگ چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں
..... یکایک پس منظر میں بہت زور سے بجلی کڑکتی ہے
اور ساتھ ہی سارے اسٹیج پر مکمل تاریکی چھا جاتی ہے .....
بادل کی گرج بہت دیر تک سنائی دیتی رہتی ہے ۔ اسی گرج
اور اندھیرے میں تیزی سے پردہ گرا کر پچھلا منظر چھپا دیا جائے
——— پردہ بالکل سادہ ہو)

تیسرا منظر

(اسٹیج پر چھایا ہوا اندھیرا بہت آہستہ آہستہ کم ہونے لگتا ہے جس میں ارون اور آشا نظر آتے ہیں۔ آشا دونوں گھٹنوں میں سر چھپائے زمین پر بیٹھی ہے اور ارون اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے جھکا ہوا کھڑا ہے ۔ ان کے علاوہ اسٹیج بالکل خالی ہے ..... ارون اور آشا پر پڑنے والی روشنی آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے .....

ارون : (آہستہ سے) آشا ..... آشا ..... اٹھو ..... آشا! (زور سے) آشا!

آشا : (گردن اٹھا کر، سہمی ہوئی آواز میں) : ——— ارون! (چیخ کر ارون کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی ہے)

ارون : اٹھو آشا ..... اٹھو، اب کچھ نہیں! ..... اب کچھ نہیں ہے .....
ڈرو نہیں! (آشا کو سہارا دیکر کھڑا کرتا ہے)

آشا : یہ ..... یہ سب کیا ہوا ارون؟ ..... یہ سب کیا تھا؟

ارون : پجاری سچ کہتا تھا ..... دیوی نے اپنا بلیدان لے لیا!

آشا : بلیدان ؟ —— نہیں، نہیں اردن ...... ! مگر.... مگر ہم تو ....؟

اردن : (ہاتھ سے دائیں طرف بتاتے ہوئے) :- ادھر دیکھو - کھنڈر پر بجلی گری ہے -

آشا : مندر پر ؟ .... نہیں، نہیں اردن ....!

اردن : ہاں آشا، .... میں نے خود دیکھا ہے -

(اردن اور آشا خاموش کھڑے دائیں طرف
دیکھتے رہتے ہیں، پس منظر میں آہستہ آہستہ
کوئی ساز سنائی دیتا ہے جو رفتہ رفتہ تیز اور بلند
ہوتا جاتا ہے، ساتھ ہی آہستہ آہستہ پردہ بھی
گرادیا جائے ——————)
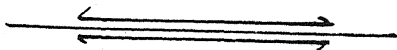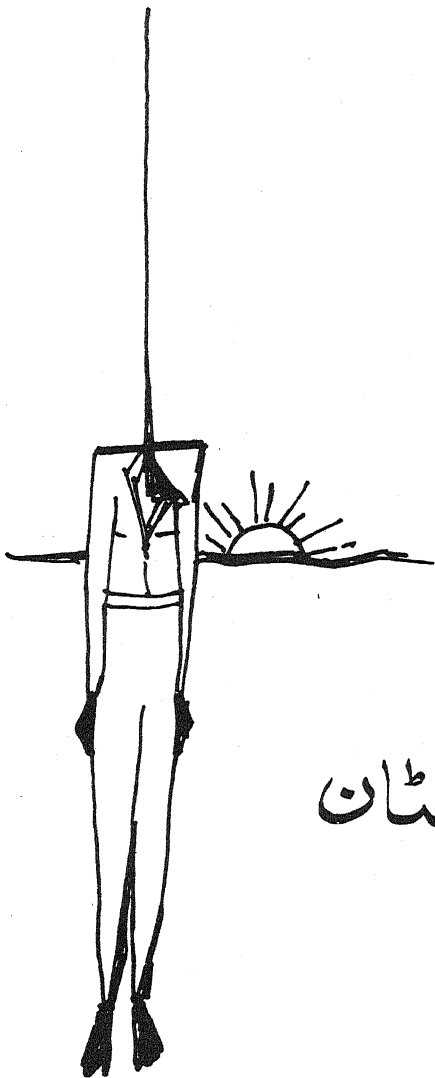
چٹان

[ایک ایکٹ ــ ایک سین]

افراد		
	۱ ۔ جیلر	۲ ۔ موہن
	۳ ۔ پنڈت جی	۴ ۔ لڑکی
	۵ ۔ اسٹنٹ جیلر	۶ ۔ کشن

منظر

[جیلر کا کمرہ ۔ پتھر کی دیواریں ۔ جن پر کھونٹیوں سے کنجیوں کے گچھے، ہنٹر، ہتھکڑیاں، زنجیریں وغیرہ لٹک رہی ہیں ۔ رات کا وقت ہے ۔ چھت سے بڑی طاقت کا ایک بلب لٹک رہا ہے ۔ جیلر کی میز پر قلم دوات کی کشتی، پیڈ، کچھ فائلیں اور ٹیلی فون رکھا ہے ۔ اسکے علاوہ ایک پرانی وضع کا بیتل کا لیمپ بجلی ہے، جو روشن نہیں ہے ۔ عقب کی دیوار سے لگے ہوئے گھنٹے میں گیارہ بج رہے ہیں ۔

پچھلی دیوار میں بائیں سرے پر ایک دروازہ اندر کے کمرے میں کھلتا ہے ۔ دروازے پر پردہ پڑا ہوا ہے ۔ اور لینٹل پر طاق نما محراب بنی ہوئی ہے ۔ (پردے کو ایک طرف سرکا دیا جائے تو اندر کمرے میں پھانسی کا ایک پھندا نظر آتا ہے، جو تیز روشنی میں چھت سے لٹک رہا ہے)

جیلر اپنی کرسی پر بیٹھا ہے ۔ میز کے تینوں جانب ایک ایک کرسی ہے ۔ دائیں جانب کی کرسی پر پنڈت جی بیٹھے ہیں ۔ دونوں کے چہروں پر تناؤ اور سنجیدگی ہے پس منظر میں تیز بارش اور بادل کی گرج کے صوتی اثرات وقفے وقفے سے

ابھرتے رہتے ہیں۔ پردہ اٹھنے پر بادل کی گرج کی آواز کے ساتھ پنڈت جی
اٹھکر دائیں دیوار کے روشن دان میں سے اوپر باہر کی طرف دیکھتے ہیں۔]

جیلر : (بے بسی کے انداز میں، چیخ کر) : یہہ بارش، آج رات نہہ ہوتی تو ......
دنیا کا کچھ بگڑ جاتا ؟

پنڈت جی : (پلٹ کر) : میں سمجھا نہیں جیلر صاحب۔

جیلر : (اٹھکر ٹہلتے ہوئے) : پنڈت جی۔ ویسے ہی دل پر ایک بوجھ سا ہے، .....
.... ایک عجیب سی الجھن ! .... اور پھر یہہ بوجھل موسم .... یہہ بارش ——
معلوم نہیں، یہہ وقت کب پورا ہوگا !

پنڈت : گیارا بج چکے ہیں۔ اب زیادہ انتظار کرنا نہیں ہے۔

جیلر : ہاں۔ شکر ہے، اب ہمیں زیادہ انتظار کرنا نہیں ہے۔
[دونوں، اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں]
—— پنڈت جی، جب آپ اس کے پاس سے اٹھ کر آئے تو .... تو کیا وہ
خاموش تھا ؟

پنڈت : وہ بالکل پریشان نہیں تھا، اس کے چہرے پر شانتی تھی۔ اور جیلر صاحب ......
.... مجھے پورا یقین ہے وہ اسی طرح رہے گا .... آخر تک۔

جیلر : پنڈت جی .... وہ بڑا ہمت والا ہے۔ اس کے دل اور دماغ فولاد کے بنے ہوئے
ہیں ...... میں نے ایسا آدمی آج تک نہیں دیکھا !

پنڈت : اور ایسے ویر کا جیون یوں برباد ہو رہا ہے، ..... کتنے دکھ کی بات ہے !
[بارش اور گرج کی آوازیں ابھر کر مدھم ہو جاتی ہیں]
..... جیلر صاحب۔ کیا ایسا آدمی ایسی حرکت کر سکتا ہے، جو اس نے کی ہے ؟

جیلر : (اٹھکر ٹہلنے لگتا ہے) : میں ایک جیلر ہوں، پنڈت جی۔ مجرم کو دیکھتے ہی
پہچان جاتا ہوں ..... (پلٹ کر) لیکن اس شخص نے سارے تجربے پر پانی پھیر دیا
...... مجھے ایک نئی الجھن میں ڈال دیا ہے۔

پنڈت : ایسا مجرم آج تک اس جیل میں نہیں آیا۔

جیلر : آج رات جب اس نے آپ کو بلوایا، تو میں سمجھا شائد آپ سے باتیں کرے گا۔

پنڈت : اور اس نے باتیں کی بھی ...... بہت ساری۔

جیلر : (جلدی سے، قریب آکر) : کیسی باتیں؟

پنڈت : ادھر ادھر کی ...... بہت سی باتیں۔

جیلر : اپنے بارے میں؟

پنڈت : نہیں۔

جیلر : کوئی بات، کوئی اشارہ ... جس سے پتہ چلے کہ اصل میں وہ کون ہے؟

پنڈت : نہیں - بالکل نہیں جیلر صاحب - وہ نہیں چاہتا کہ ہم اس کا اصلی روپ جان لیں۔ وہ اپنے آپ کو اندھیرے میں رکھ کر مرنا چاہتا ہے ...... کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں، وہ خود بھی اپنے سے واقف ہے یا نہیں!

جیلر : (ذرا دیر رک کر) : بات بس اتنی ہے پنڈت جی کہ وہ کسی کی خاطر ایسا کر رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ کسی کا نام سب کو معلوم ہو جائے - موہن لال اسکا اصلی نام نہیں ہے، یہ ہم جانتے ہیں - اور یہ بھی کہ جو کہانی اس نے اپنے بارے میں سنائی ہے وہ بھی من گھڑت ہے۔

پنڈت : آخر وہ چاہتا کیا ہے؟

جیلر : وہ گم نامی میں مرنا چاہتا ہے - اپنے خاندان کے لوگوں اور دوستوں سے الگ ... ایسی کوشش اس سے پہلے بھی لوگ کر چکے ہیں، ..... مگر یہ سب سے بازی لے گیا! [قریب آکر پنڈت جی کو گھورتے ہوئے] .... اسے یہاں آئے پانچ مہینے ہو چکے - مگر ہم اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ (رک کر، دور جاتے ہوئے) کچھ بھی نہیں - وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے - اس کی پچھلی زندگی کیسی رہی ہے .... کچھ بھی نہیں جانتے! ہمارے لئے وہ آج بھی صرف موہن لال ہے ..... قیدی نمبر سترا .... جیسے .... جیسے آج رات ....

.... (رک جاتا ہے)

پنڈت : ایسے وقت سب اپنے عزیزوں دوستوں کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں، مگر وہ چاہتا ہے کہ اکیلا ہی .... ہر چیز کا مقابلہ کرے۔ ایسی ہمت ہر ایک میں نہیں ہوتی.... وہ سب سے الگ ہے جیلر صاحب ! اس آخری وقت بھی میں اس کے دل میں بھگوان کا ڈر نہیں ڈال سکا ! [جیلر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے] ..... ایسا کبھی نہیں ہوا تھا ....

جیلر : کیا بجا ہے پنڈت جی ؟

پنڈت : ساڑھے گیارہ

جیلر : (دونوں ہاتھوں پر ٹھوڑی لٹکا کر) : پنڈت جی ..... شائد اب میں بوڑھا ہو چلا ہوں .... پہلے ایسے موقعوں پر اتنا پریشان نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب جب بھی کسی کو پھانسی دینی ہوتی ہے تو کئی دن پہلے سے الجھن ہونے لگتی ہے۔ جو بعد میں بھی کئی دن تک رہتی ہے .... اور پھر آج کی رات تو .... (ٹھوڑی اٹھا کر، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیتا ہے).... پتہ نہیں، کیسے کر سکوں گا یہ سب !

پنڈت : جیلر صاحب۔ کسی کو پھانسی پر چڑھانا کوئی خوشی کا کام نہیں ہے ...... چاہے وہ کیسا ہی مجرم کیوں نہو !

جیلر : میں جانتا ہوں۔ پھر بھی اس شخص کے لئے میں اتنا پریشان کیوں ہوں ؟

پنڈت : شائد اس لئے کہ وہ اپنی ضد میں کامیاب رہا۔ اور ہم ہار گئے .... ورنہ اس کے مجرم ہونے میں تو کوئی شبہہ ہے ہی نہیں .... (اٹھکر روشن دان کے قریب تک جاتا ہے۔ بادل کی گرج سنائی دیتی ہے۔ پلٹ کر قریب آتے ہوئے کہتا ہے)

——— اس نے ایک شخص کا قتل کیا ہے۔ اور یہ قتل سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بے رحمی کے ساتھ کیا گیا ہے .... اس نے اپنے جرم کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔

[پنڈت جی جیلر کے قریب، اسے گھورتے ہوئے
خاموش کھڑے ہوجاتے ہیں ——]

جیلر : (غصے میں سر ہلاتے ہوئے) : مگر اس کی باتیں، اس کی حرکتیں، مجرم کی سی نہیں ہیں ...... (زور سے چیخ کر) نہیں ہیں ! (اٹھکر پنڈت جی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے) پنڈت جی، مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے آج کی رات ...... مجرم وہ نہیں، میں ہوں ! ...... جو کچھ اس کے ساتھ کیا جانے والا ہے، وہ جرم ہے، ناانصافی ہے ! ..... (کچھ دور جاکر، یکایک پلٹتا ہے) اور میں اس کا ذمہ دار رہوں گا ! .... (قریب آکر، بے بسی سے گردن ہلاکر) ...... پنڈت جی، میں سچ مچ بوڑھا ہوگیا ہوں۔ مجھے ریٹائر ہوجانا چاہیئے۔

[آہستہ آہستہ جاکر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور ڈرائر میں
سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر ایک سگریٹ سلگاتا ہے]

پنڈت : (کرسی پر بیٹھ کر، رکتے رکتے کہتے ہیں) : آج رات، ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اس سے باتیں کر رہا تھا، ... تو مجھے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آئی ...... (جیلر گردن اٹھاکر دیکھتا ہے) شائد ..... ایسی ہی چمک آنکھوں میں لے کر لوگ وطن کی خاطر پھانسی کے تختے پر چڑھ جاتے ہیں ——

جیلر : مگر وہ وطن کی خاطر جان نہیں دے رہا ہے۔

پنڈت : (تائید میں گردن ہلاتے ہوئے) : اور نہ کوئی مذہبی معاملہ ہے ..... (رک کر، اوپر دیکھتے ہوئے) اسے تو دھرم یا بھگوان کا بھی پتہ نہیں ہے !

جیلر : کیا ...... کوئی اور مذہب، ...... ؟

پنڈت : (بات کاٹ کر) : نہیں۔ خدا، بھگوان، ..... جنت، دوزخ ..... اسے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ میری باتیں سنتا ضرور ہے، لیکن محض اکیلے پن کو بھلانے کے لئے۔

جیلر : اگر وہ ایک دہریئے کے روپ میں بھگوان کے پاس جانا چاہتا ہے، تو ہم کیا

کر سکتے ہیں۔ ہم اس کے خیالات نہیں بدل سکتے۔

پنڈت : مگر اس کی آتما کو بچا سکتے ہیں۔ آتما .... جو مرتی نہیں! (جیلر کو مسلسل دیکھتے ہوئے) آج رات مجھے محسوس ہوا، کہ اس کی آتما، اسکے شریر کے اندھیاروں میں بھٹک رہی ہے، جیسے ..... آسیب زدہ گھر کے اندر کوئی بے چین روح۔ شائد ہم اسے بچانے میں کامیاب ہو جائیں ..... شائد ہم اسے روشنی کا ایک چھوٹا سا چراغ دکھا سکیں! ....

(نظریں ہٹا کر، جیسے اپنے آپ سے) میں ابھی نراش نہیں ہوا ہوں۔

جیلر : آپ کبھی نراش نہیں ہوتے پنڈت جی۔ آپ کا کام آشا کو جلائے رکھنا ہے۔

پنڈت : (رک رک کر) کیا آپ ...... اس سے ..... ایک بار پھر مل کر ..... باتیں کریں گے؟

[جیلر تھوڑی دیر چپ رہتا ہے۔ پھر اٹھکر چند قدم
چلتا ہے۔ پھر رک کر پلٹتا ہے]

جیلر : ہاں۔ (وقفہ) ...... اس لفافے میں آٹھ ہزار کا چیک ہے (جیب میں سے ایک لفافہ نکالتا ہے) جو اس کے نام ہے (ٹہلنے لگتا ہے) یہ بھی دلچسپ بات ہے، جب اس اخبار کے ایڈیٹر نے اسے اپنی کہانی لکھنے پر آٹھ ہزار کا آفر دیا، تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ میں سمجھا کہ شائد وہ یہ روپے کسی کے پاس بھجوانا چاہتا ہے، ..... یا کسی اور کام میں خرچ کرنا چاہتا ہے ...... لیکن اب یہ چیک یونہی پڑا ہے ..... اور اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ کچھ نہیں بتاتا، اس کا کیا کیا جائے! ...... جلتے ہو پنڈت جی کیوں؟ اس لئے کہ جو کہانی اپنی زندگی کی اس نے لکھی ہے، وہ سرے سے جھوٹی ہے، فرضی ہے! .... وہ چاہتا تھا اس طرح ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر ہمیں بیوقوف بنائے۔ اس چیک سے اسے کوئی دلچسپی نہیں، ...... لیکن مجھے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا! اس لئے میرا اس سے ملنا ضروری ہے۔ (رک کر) ...... اس کے علاوہ میں چاہتا ہوں ایک آخری کوشش اور کر لوں یہ جاننے کی کہ وہ کون ہے، اس کا اصلی نام کیا ہے!

ت : کیا میں بھی آپ کے ساتھ اس کے پاس چلوں گا ؟ یا آپ اکیلے ہی ملنا چاہتے ہیں۔

[جیلر جواب نہیں دیتا۔ کچھ دیر بے چینی سے ٹہلتا رہتا ہے۔
پھر آکر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور پنڈت جی کی طرف
دیکھے بغیر، آہستہ سے کہتا ہے ــــــــ]

لر : پنڈت جی ؟

رت : جی

لر : کیا ایسا ہو سکتا ہے [دو جار دفعہ۔ پنڈت جی جیلر کو دیکھتے رہتے ہیں]
...... میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آرہا ہے۔ اور جی چاہ رہا ہے،
میں ایسا ہی کروں ...... ایسا کبھی ہوا نہیں، اس جیل میں۔ پھر بھی ......
اگر ہو تو ؟ ــــــــ

ڈت : آپ کیا کرنا چاہتے ہیں ؟

یلر : میں چاہتا ہوں اسے یہاں بلالوں، ...... اس آفس میں۔ بجائے اس کے کہ میں
اور آپ اس کمرے میں جائیں، اس سے یہیں باتیں کریں گے ..... (جذباتی سا ہو کر
پھر کھڑا ہو جاتا ہے) ...... وہ یہاں اس کرسی پر بیٹھا رہے گا۔ (بائیں جانب
کی کرسی کی طرف بتاتے ہوئے) ...... اس وقت تک، جب تک کہ ......
وقت پورا ہو جائے، اور ہم سب ساتھ ہی اٹھکر اس دروازے کے اندر چلے جائیں
(پردہ پڑے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)
...... پھانسی کے چبوترے کی طرف۔

نڈت : لیکن ایسا کرنا قاعدے کے خلاف ہے۔

جیلر : ہونے دیجئے۔

نڈت : لیکن ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں آپ ؟

جیلر : (رک کر) : ــــــــ ہو سکتا ہے، یہاں میرے اور آپ کے درمیان بیٹھکر
کچھ دیر باتیں کرنے سے اس کے ذہن کو سکون ملے۔ اور وہ زیادہ کھل کر باتیں کرے

.... اور اپنے بارے میں بھی کوئی بات بتا دے !' ہو سکتا ہے !.....

.... یہہ آفس اسکی کوٹھری سے مختلف ہوگا ' یہاں اسے زیادہ آزادی محسوس ہوگی۔

پنڈت : شائد آپ نے ٹھیک سوچا ہے جیلر صاحب۔

جیلر : ایک بات اور بھی ہے پنڈت جی۔ اسے پھانسی کے لئے یہاں سے لے جائیں گے تو دوسرے قیدیوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ ورنہ ' پچھلی دفعہ ' آپ کو یاد ہوگا اس لنگڑے کو لے جاتے وقت ' قیدیوں نے کتنی چیخ پکار مچائی تھی !....... اب ہمیں اور دیر نہیں کرنی چاہئیے ...... (پکارتا ہے) اسسٹنٹ صاحب۔

اسٹنٹ : (آتا ہے) : یس سر۔؟

جیلر : دیکھیے ..... آپ جاکر موہن لال کو یہاں لے آئیے ..... (ایک سکنڈ رک کر) ..... آپ اس طرح میری طرف کیا دیکھ رہے ہیں ؟ .... جاتے کیوں نہیں ؟

اسٹنٹ : (رک رک کر) : کیا ..... موہن لال کو .... یہاں ......؟!

جیلر : ہاں ..... (اشارا کرتے ہوئے) یہاں ' اس کمرے میں ...... جائیے۔

اسٹنٹ : جی بہت اچھا۔ (جانے کے لئے مڑتا ہے)

جیلر : ذرا رکئے اسسٹنٹ صاحب ...... کیا سب تیاریاں ہو چکی ہیں ؟

اسٹنٹ : جی ہاں - ابھی کچھ دیر میں سب لوگ تیار ہو جائیں گے۔

جیلر : کتنی دیر میں ؟

اسٹنٹ : پندرہ یا بیس منٹ میں

جیلر : اسسٹنٹ جیلر صاحب۔ آپ سب سے کہہ دیجئے ' بیس منٹ بعد ہر چیز پوری طرح تیار رہنی چاہئیے۔ .... میں نہیں چاہتا کہ آج کی رات آخری منٹ پر کوئی کسر باقی رہ جائے۔

اسٹنٹ : یس سر

جیلر : اور جب سب تیاری ہو چکی تو آپ آکر مجھے اطلاع کردیں۔

اسٹنٹ : جی اچھا۔

جیلر : میں یہیں رہوں گا، موہن لال اور پنڈت جی کے ساتھ۔

اسٹنٹ : (حیران ہوکر) : یہاں .... ؟!

جیلر : ہاں۔ یہاں ...... اسی کمرے میں۔

اسٹنٹ : یس سر۔

جیلر : جب وہاں سب لوگ ساری تیاریاں کر چکیں تو آپ (بائیں طرف اشارہ کرکے) اس طرف سے آئیے۔ اور آہستہ سے اس دروازے پر سے پردا ہٹاکر کھڑے ہوجائیے۔

اسٹنٹ : یس سر۔

جیلر : آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بس پردا کھول کر خاموش کھڑے ہوجائیے ....
.... یہہ اشارہ ہوگا .... ہماری .... ہم لوگوں کی یہاں سے روانگی کا۔
سمجھ گئے آپ؟ ...... اب جائیے۔ اور موہن لال کو یہاں لے آئیے۔

[اسٹنٹ ایک دو سکنڈ خاموش کھڑا جیلر کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر چپ چاپ چلا جاتا ہے]

پنڈت : جیلر صاحب .... گواہوں اور اخبار کے رپورٹروں کے بارے میں کیا سوچا ہے؟

جیلر : (جھنجلاکر) : ہونہہ ..... گواہ ..... رپورٹر .... وہ سب لوگ باہر کینٹین میں بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں وہ لوگ وہیں بیٹھے چائے اور کافی پیتے رہیں ..... اور ......

[ٹیلی فون کی گھنٹی چونکا دینے والی آواز کے ساتھ بج اٹھتی ہے —]

—— ہیلو ...... یس ..... کیا کہا ..... بول رہا ہوں ....
(ٹیلی فون پر ہاتھ رکھ کر، آہستہ سے) پنڈت جی۔ منسٹر کا فون ہے۔

[پنڈت جی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں]

..... (ٹیلی فون پر سے ہاتھ ہٹاکر) .... یس سر۔ میں جیلر بات کر رہا ہوں.....
آداب عرض ہے ...... جی ہاں، جی ہاں ...... زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں، سب تیاری ہو چکی ہے ..... جی نہیں سر۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ آپ

اطمینان رکھیں .... جی؟ ... قانون کے لحاظ سے آدھی رات کے بعد مجھے یہ
کام جلد سے جلد کر دینا ہے ...... جی ہاں۔ آپ کے ORDER سے دیر
ہو سکتی ہے ...... جتنی آپ چاہیں ...... جی کیا فرمایا؟ لڑکی؟ ....
آپ ایک لڑکی کو یہاں بھیج رہے ہیں .... روانہ بھی ہو چکی؟! ......
جی نہیں۔ ابھی یہاں نہیں پہنچی ...... (چند سکنڈ کا وقفہ) ....
جی ہاں۔ جی اچھا ...... جب سب ہو چکے گا تو میں آپ کو فون پر اطلاع دوں گا۔
...... جی۔ آداب عرض ہے۔

[ایک لمبا سانس لیتا ہے اور کرسی پر بیٹھ جاتا ہے]

پنڈت : (آواز سے پریشانی اور ڈر ظاہر ہو رہا ہے) : کیا بات ہے۔ جیلر صاحب!؟

جیلر : کوئی لڑکی ہے جو سمجھتی ہے موہن لال اس کا بھائی ہے۔ وہ بچپن میں اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اس نے منسٹر صاحب سے کہہ سن کر اجازت لے لی ہے کہ آج رات یہاں آ کر موہن لال سے ایک بار مل لے۔ منسٹر صاحب نے کہا ہے کہ اس ملاقات تک ہم رکے رہیں۔ انہوں نے اسے اپنی موٹر میں بھیجا ہے ...... اب وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والی ہے۔

پنڈت : بے چاری لڑکی!

جیلر : پنڈت جی۔ جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، تو آپ جانتے ہیں، میرے دل میں کیا خیال آیا؟

پنڈت : ( ) : جی ہاں۔ ایسا ہی خیال میرے بھی دل میں آیا تھا، کتنی عجیب بات ہے ہم اس شخص کی معافی کی خواہش کر رہے ہیں، جس کے مجرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

[دائیں دروازے سے موہن لال آتا ہے]

جیلر : آؤ موہن لال ...... یہاں اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔

[پیچھے اسسٹنٹ جیلر بھی آتا ہے]

. . . . شکریہ (بیٹھ جاتا ہے - پنڈت جی کے مقابل کی کرسی پر)

(اسسٹنٹ جیلر سے) : آپ جا سکتے ہیں۔

[اسسٹنٹ جیلر واپس چلا جاتا ہے]

(موہن لال سے مخاطب ہو کر) . . . . . موہن لال - پچھلے پانچ مہینے سے تم یہاں
جیل میں میری نگرانی میں رہے ہو - اور اس دوران میں تمہارا رویہ ہمیشہ اچھا رہا ہے۔
میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کسی اور طریقے سے بھی رہنا چاہیئے تھا۔

(جلدی سے) : یہہ مطلب نہیں ہے میرا . . . . . .

(بات جاری رکھتے ہوئے) : میں جانتا ہوں جیلر صاحب آپ مجھ پر ہمیشہ مہربان
رہے ہیں - اور پنڈت جی بھی . . . . . ! میں بڑے آرام سے رہا ہوں۔

(رک کر) : میں نے تمہیں یہاں اس لئے بلایا ہے کہ . . . . . اب . . . . . آخر تک . . .
تم ہمارے ساتھ رہوگے . . . . یہیں . . . . . میرے اور پنڈت جی کے ساتھ
. . . . (موہن لال کی آنکھوں میں دیکھکر) اب تم واپس اس کمرے میں نہیں جاؤگے

(سادگی سے) جی -

(جذباتی سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) : تم سمجھے نہیں شائد . . . . . یہہ جو کچھ میں تمہارے
ساتھ کر رہا ہوں، کسی اور کے ساتھ آج تک نہیں کیا تھا۔

جی ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن آپ کو شائد اس لئے عجیب لگ رہا ہے کہ میں اس
پر خوش کیوں نہیں ہو رہا ہوں!

(جلدی سے) . . . . . یہہ بات نہیں۔ جیلر صاحب چاہتے ہیں کہ تمہارے دل کو شانتی ملے۔
مگر انہیں یہہ نہیں معلوم کہ اب میرے لئے یہہ کمرہ . . . . یا وہ کوٹھری سب ایک ہیں۔

[جیلر بے چینی سے ایک دو قدم چل کر رک جاتا ہے اور مڑ کر
خاموشی کے ساتھ موہن لال کو دیکھتا ہے]

. . . . یہہ کیسے ؟

اسلئے کہ میں اس کمرے میں بھی اتنا ہی قید ہوں ! . . . . . مجھے معلوم ہے کہ

اس کھڑکی کے باہر، یا اس دروازے کے پیچھے، بندوقیں لئے سپاہی کھڑے ہیں۔
[اشارے سے بتاتا جاتا ہے] ان کے پیچھے دالان میں، باہر میدان میں، اور زیادہ
سپاہی ہیں..... اتنی ہی بندوقیں بھی!...... کیا میں اس کمرے سے نکل
سکتا ہوں!...... (رک کر، آہستہ سے) اور ادھر اس دروازے کے
...... (ہاتھ سے پردے والے دروازے کو بتاتا ہے) دوسری طرف کیا ہے،..... مجھے
معلوم ہے..... مجھے سب معلوم ہے......، [چند سکنڈ سب چپ رہتے ہیں]
...... پھر بھی یہ جگہ شائد اس کمرے سے بہتر ہے۔ کیا میں یہاں سگریٹ
پی سکتا ہوں؟

جیلر : (قریب آکر) ...... ہاں۔ کیوں نہیں۔ یہ لو۔

[میز کے خانے میں سے سگریٹ اور لائٹر نکال کر دیتا ہے۔
موہن لال سگریٹ سلگا کر ایک بھرپور کش لیتا ہے]

موہن، میں چاہتا ہوں تم ایک بار پھر ان باتوں پر غور کرلو، جو میں نے
اور پنڈت جی نے تم سے کہی ہیں..... پھر وقت نہیں رہے گا......

موہن : میں مسلسل انہی پر غور کرتا رہا ہوں جیلر صاحب۔

جیلر : (چونک کر موہن لال کو دیکھتا ہے) : تو پھر..... میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔
...... تم کون ہو؟

موہن : میں کون ہوں؟..... موہن ... موہن لال..... ایک قاتل۔

پنڈت : یہ تمہارا اصلی نام نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں۔

موہن : مگر آپ پھانسی پر میرے نام کو نہیں، مجھے چڑھائیں گے۔

جیلر : تم جانتے ہو تمہارا ایک اور نام بھی ہے۔

موہن : میں بھول چکا ہوں۔

جیلر : (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) : تو تم طے کر چکے ہو، نہیں بتاؤ گے۔

موہن : یہی سمجھئے۔

[جیلر آکر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے - اور ایک فائل کھول کر اوندھا
دیتا ہے - جس میں سے بہت سارے خط نکل کر میز پر
گر جاتے ہیں ———————]

جیلر : ——— ان سے کہیں زیادہ خط اور بھی ہیں، ادھر الماری میں (اشارے سے الماری کو بتاتا ہے) - ملک کے ہر کونے سے یہ خط آئے ہیں ... (موہن لال کی آنکھوں میں دیکھکر) جانتے ہو ان میں کیا لکھا ہے ؟ .... اتنے بہت سے لوگ مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں ؟ ———————

[موہن لال خاموش، کھویا ہوا سا دیکھتا رہتا ہے]

...... تم کون ہو؟ تم ان کے کھوئے ہوئے بیٹے، بھائی، ... شوہر تو نہیں ہو ؟

موہن : (دھیمے سے) آپ نے ان کو جواب بھیج دئے ہیں ؟

جیلر : نہیں - میں تم سے جواب چاہتا ہوں -

موہن : مجھ سے ! ..... میں کیا کہہ سکتا ہوں - میرا کوئی نہیں ہے -

جیلر : میری بات سمجھنے کی کوشش کرو موہن - تمہیں اپنا دل بڑا کرنا ہوگا - مان لو کہ تم نے اپنا اصلی نام بتا دیا - اور میں نے اسے اخباروں میں چھپوا دیا، جانتے ہو اس سے کیا ہوگا ؟ .... اس سے یہ ہوگا کہ سارا غم، سارا دکھ سمٹ کر ایک گھر والوں کے حصے میں آجائے گا ..... ہے نا ؟ .... تم نہیں چاہتے کہ انہیں تمہاری وجہ سے دکھ پہنچے - لیکن ذرا اس بات کے دوسرے پہلو پر بھی غور کرو - تم سچ سچ بتا دوگے تو ایک تمہارے خاندان کے سوا، باقی کتنے لوگ دن رات کی اذیت اور دماغی الجھن سے نجات پا سکیں گے ! انہیں شانتی مل جائے گی - کیا ان کے لئے تمہارا کوئی فرض نہیں ہے ؟ کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ ..... (رک جاتا ہے) - میں جانتا ہوں اس کے لئے بڑی ہمت کی ضرورت ہے - مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ تم میں اس کی کمی نہیں ہے -

موہن : ——— آپ جو چاہتے ہیں، میں نہیں کر سکتا جیلر صاحب -

پنڈتا : میرے بچے - جیلر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں - دوسروں کے خاطر قربانی دینے میں ہی

بڑائی ہے ....

[موہن لال انکار میں گردن ہلاتا ہے]

سوچ لو .... پھر ایک بار سوچ لو۔ شائد تم ..... تمہاری سمجھ میں آجائے۔

موہن : (جیلر سے) : جیلر صاحب۔ آپ جب ان خطوں کا جواب لکھیں تو ان لوگوں کو صاف صاف بتا دیجئے، میں وہ نہیں ہوں، جس کی انہیں تلاش ہے، اور ..... اور یہی حقیقت بھی ہے۔ کیونکہ میرا کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں، نہ بہن ..... نہ بھائی ..... نہ بیوی۔ اور اب میری درخواست ہے، اس بارے میں کوئی گفتگو نہ کی جائے۔

پنڈت : جیسی تمہاری مرضی۔

جیلر : ایک بات اور بھی ہے۔ [جیب میں سے چیک والا لفافہ نکالتا ہے] اس لفافے میں دس ہزار روپے کا چیک ہے۔ اور تم اس کے مالک ہو۔ تم جسے چاہو دے سکتے ہو .... (چیک نکالتا ہے) ..... یہ دیکھو۔

موہن : (چیک لے کر) خوب صورت ہے۔

جیلر : بتائیے۔ میں اس کا کیا کروں۔

موہن : (پھیکی ہنسی) : جیلر صاحب۔ کیا آپ سچ مچ سمجھتے ہیں کہ میں اس طرح آپ کو بتا دوں گا ..... جو آپ جاننا چاہتے ہیں؟

جیلر : نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس چیک کا کیا کروں! ..... میں اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔

موہن : اس وقت میں بھی نہیں جانتا، اس کا کیا کیا جائے ..... شائد ایک آدھ منٹ میں کچھ سمجھ میں آجائے ..... آپ کو کچھ بتا سکوں ..... (رک کر) اور کوئی بات؟

جیلر : نہیں۔ اور کچھ نہیں ..... سوائے اس کے کہ اگر تم چاہو تو کوئی بیان دے سکتے ہو ..... پریس کے لئے۔

موہن : نہیں۔ میں اس سے پہلے جو کچھ کہہ چکا ہوں، اس کے علاوہ اور کچھ کہنا نہیں ہے۔ میں نے ایک شخص کا خون کیا ہے، اور اس کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہے ..... ۔

میرا مطلب ہے، اُس خاص شخص کو مار ڈالنے کا مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔

پنڈت : سنو میرے بچے ۔ بھگوان سے اپنے پاپوں کی معافی مانگنے پر وہ معاف کر دیتا ہے، ... اور اس طرح آتما کو شانتی ....

موہن : (بات کاٹ کر) : میری آتما کو کچھ نہیں ہوا ہے پنڈت جی ۔ وہ بہت اچھی طرح ہے۔ اور نہ ہی میں نے کوئی پاپ کیا ہے، جس کے لئے آپ کے بھگوان سے معافی مانگنے کی ضرورت ہے ۔ [موہن لال ایک نیا سگریٹ سلگا کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ اور تین چار قدم چل کر رک جاتا ہے ۔ پلٹ کر دونوں کو دیکھتے ہوئے کہتا ہے] ——— اس شخص کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا ۔ اسے مار کر میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے ۔ [بیک گراؤنڈ میں پیانو کے ہلکے ہلکے سر ابھرتے ہیں] میں نے اسے یکایک غصے کے جذبات میں آکر نہیں مارا ہے ۔ ایسا کرتا تو سچ مچ افسوس ہوتا ۔ اُونہوں (گردن ہلا کر) .... میں نے تو اسے بہت سوچ بچار کے بعد قتل کیا ہے ۔ جو کچھ اس نے کیا تھا، اس کے بعد اسے زندہ نہیں چھوڑا جا سکتا تھا ...... [بیک گراؤنڈ میں بارش اور بادل کی گرج]

...... مجھے کوئی انسوس نہیں ۔ کوئی شکایت یا کسی سے کوئی شکوہ نہیں .... کسی سے بھی نہیں ۔ [واپس اپنی کرسی پر بیٹھکر] قانون سے بھی نہیں ۔ اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیئے تھا ۔ انسان جو کرتا ہے، اس کا بدلہ اسے ضرور ملتا ہے ۔ یہہ بات زندگی نے مجھے اتنی کم عمری میں ہی سکھادی ہے ۔ اور .... اور میں اپنے کیئے کی قیمت چکانے جا رہا ہوں ...... (مڑ کر پردے والے دروازے کی طرف اشارہ کرکے) اُدھر اس دروازے کی دوسری طرف ! ابھی، ...... کچھ دیر میں میں یہہ قیمت چکا دوں گا .... اور وہاں جب میرا بے جان جسم لٹک رہا ہوگا .... اور میری آتما کو بھگوان کے سامنے لے جایا جائے گا ...... ؟!

پنڈت : (بات کاٹ کر) : تمہیں ان باتوں پر پورا یقین ہے ؟

موہن : ہاں، ہے ..... میں سمجھتا ہوں ۔ میں اس کے بعد بھی زندہ رہوں گا ... کیا اس دنیا میں جس کی عمر لاکھوں کروڑوں سال ہے، میں صرف ۲۸، اٹھائیس سال

زندہ رہنے کے لئے بھیجا گیا تھا! نہیں .... میری آتما بعد میں بھی زندہ رہے گی ' و ..... اور بھگوان کے سامنے جانے سے مجھے کوئی ڈر نہیں لگ رہا ہے ' کیونکہ د.ب.ل وہ دوسرا شخص بھی ہوگا اور میں بھگوان کو پوری بات سنا سکوں گا ۔ اصل کہانی ..... جو آپ نے نہیں سنی ..... عدالت نے بھی نہیں سنی ۔ وہ وہاں میں بھگوان کو سناؤں گا ۔ اور اگر وہ بھگوان ایسا ہی ہے پنڈت جی جیسا کہ آپ نے بتایا ہے تو ..... مجھے اس سے کوئی ڈر نہیں ۔

[پیانو کے سُر تیز ہو جاتے ہیں]

پنڈت : میرے بچے .... تمہیں ایسی بات ......

موہن : (اپنی رو میں ' بات کاٹ کر) : اور اگر یہ بھگوان ..... یہ آتما ' یہ سب کچھ نہیں ' اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ' تو ..... تو بھی مجھے کوئی شکایت نہیں ہے ' کیونکہ اس دنیا میں میرا اور اس شخص کا حساب پورا ہو چکا ہے ۔

[پیانو کے تیز سر خاموش ہو جاتے ہیں ۔ ایک دو لمحے کا وقفہ اس دوران میں جیلر کا آدمی ' کشن ' دائیں دروازے سے آتا ہے ———]

جیلر : کیا ہے کشن ؟

کشن : ایک لڑکی آپ سے ملنا چاہتی ہے ۔

جیلر : (آہستہ سے) : او ..... تو وہ آگئی!

کشن : اس کے ساتھ منسٹر صاحب کی یہ چٹھی ہے ۔ [ایک لفافہ میز پر رکھ دیتا ہے]

جیلر : (چٹھی نکالتے ہوئے) ...... اس کی تلاشی ہو چکی ؟

کشن : جی ہاں ۔

جیلر : (چٹھی دیکھتے ہوئے) : ہوں ..... ٹھیک ہے ۔ اسے ادھر پچھلے کمرے میں بٹھاؤ ۔ جب میں بلاؤں تو لے آنا .....

کشن : بہت اچھا صاب ...... (واپس جاتا ہے)

جیلر : (موہن سے) : ایک لڑکی تم سے ملنے آئی ہے ۔ ملو گے اس سے ؟

موہن : نہیں ..... (ذرا رک کر) وہ کیا چاہتی ہے؟

جیلر : وہ سمجھتی ہے، تمہاری بہن ہے۔ اور تمہاری تلاش میں بہت دور سے آئی ہے۔

موہن : (رکھائی سے) : اس کا خیال غلط ہے۔ میرے کوئی بہن نہیں ہے۔

جیلر : تو کیا، جاکر اس سے کہہ دوں، تم ملنا نہیں چاہتے؟

موہن : کہہ دیجئے ..... (رک کر) ذرا ٹھہریئے .... آپ نے کہا تھا .... دور سے آئی ہے؟

جیلر : ہاں۔ اور اس نے خاص طور پر منسٹر صاحب سے اجازت لی ہے .... تم سے ملنے کی۔

پنڈت : تمہیں اس سے مل لینا چاہیئے، میرے بچے .... ایک منٹ کے لئے ہی سہی۔

موہن : (ذرا سے توقف سے) : کیا میں اس سے .... یہیں بات کر سکتا ہوں؟

جیلر : ہاں - اکیلے میں۔

موہن : (پھیکی ہنسی) : اور اگر اس کے پاس کوئی چھپا ہوا پستول یا سائنائیڈ کی ٹکیا ہو تو؟

جیلر : مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ تم کوئی ایسی حرکت نہیں کروگے (رک کر، پنڈت جی سے کہتا ہے) پنڈت جی؛ آپ موہن لال کو لے کر ایک دو منٹ کے لئے جیلر کے کمرے میں چلے جائیے

.... اس لڑکی سے پہلے میں ایک دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

[پنڈت جی کے پیچھے، ذرا سے توقف کے بعد موہن لال بھی بائیں طرف سے چلا جاتا ہے۔ اور دائیں جانب سے کشن، جیلر کی آواز پر لڑکی کو لے کر آتا ہے۔]

.... آئو ... آؤ .... اس طرف اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔

(لڑکی بیٹھ جاتی ہے، کشن واپس چلا جاتا ہے)

...... تو تم ...... موہن لال سے ملنا چاہتی ہو!

لڑکی : جی ہاں .... (بے چین سی ہو کر) کہیں مجھے دیر تو نہیں ہو گئی؟

جیلر : نہیں۔ دیر نہیں ہوئی...... مگر پہلے میں تم سے دو ایک باتیں پوچھنی چاہتا ہوں، ..... گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے؛ ..... یہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں کوئی مشکل .... کوئی پریشانی نہ ہو .... سمجھیں؟ ....

(رک کر) تم کہاں رہتی ہو؟

لڑکا : ہری پور میں

جیلر : ہری پور؟

لڑکی : جی ہاں۔ دلّی کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔

جیلر : وہاں تم اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی ہو؟

لڑکی : ماں کے ساتھ۔ باپ تو جب میں چھوٹی سی تھی ....

جیلر : ہوں .... تو تمہاری بجائے ماں کیوں نہیں آئیں؟

لڑکی : وہ نہیں آسکتی تھیں .... بیمار ہیں۔

جیلر : اوہ .... تمہارے کوئی بھائی بہن ہیں ....

لڑکی : بس ایک بھائی ہے۔ یہی ..... جس کے لئے میں آئی ہوں۔

جیلر : کیا وہ تم سے عمر میں بڑا ہے۔

لڑکی : جی ہاں۔ کوئی دس سال ...... مگر ہم دونوں میں بڑی محبت تھی۔

جیلر : وہ گھر چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟

لڑکی : ٹھیک سے نہیں معلوم۔ شائد شہر میں جا کر رہنا چاہتا تھا ...... ہری پور چھوٹی سی جگہ ہے نا۔

جیلر : اس بات کو کتنے دن ہوئے؟

لڑکی : دس برس۔

جیلر : (اُٹھکر ٹہلنے لگتا ہے) : ھُم ...... دس برس ..... اور کیا تمہیں یقین ہے اتنے دن بعد اسے دیکھو گی تو پہچان لوگی؟

لڑکی : (رک کر) ہاں۔ پہچان لوں گی .... یا شائد نہ پہچان سکوں! .... میں کہہ نہیں سکتی۔ میں بہت چھوٹی سی تھی نا جب بھیّا گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اور .... پھر اتنے دن نہ معلوم کیسی مصیبتوں میں رہے ہیں۔ کیا کیا دکھ جھیلے ہیں۔ .... ان کا وہ بھولا بھالا چہرہ نہ معلوم اب کیسا ہو گیا ہو گا!

جیلر : تمہیں یہہ کیسے خیال آیا کہ موہن لال تمہارا بھیا ہے ..... اور پھر تم اسے دیکھنے آج آئی ہو! ..... اب! ..... یہہ کیس تو اخباروں میں بہت دن سے آ رہا تھا۔

لڑکی : میں نے پچھلے ہفتے ایک میگزین میں وہ کہانی پڑھی جو اس نے اپنے بارے میں لکھی ہے وہ میں نے ماں کو بھی سنائی .... وہ بہت مختصر سی تھی۔ پھر بھی اس کے ایک حصے کو سن کر ماں کو شبہہ ہوا شائد یہہ وہی ہے ——————

..... اور پھر میگزین میں تصویر بھی تھی، لیکن اس سے کوئی زیادہ مدد نہیں ملی .... بس اک ذرا سی جھلک بھیا کی سی تھی۔ ماں بے چین ہو اٹھی ..... کہنے لگی میں جا کر یقین کر آؤں۔

جیلر : ماں آ سکتیں تو ... بہت اچھا تھا۔ شائد وہ اس کے بدلے ہوئے چہرے کو بھی ....

لڑکی : (درمیان میں) میں بھی پوری کوشش کروں گی۔

جیلر : (ہاں کہیں یہ سمجھ جاتا ہے) ؛ کیا گھر سے جانے کے بعد تمہارے بھیا نے کبھی کوئی اطلاع نہیں بھیجی؟

لڑکی : —————— کوئی پانچ چھ سال پہلے ایک خط آیا تھا۔

جیلر : کہاں سے؟

لڑکی : بمبئی سے۔ لکھا تھا، آرام سے ہوں۔ وہاں کسی کتابوں کی فرم میں نوکر ہو گئے تھے۔ ...... انہیں کتابوں کا بڑا شوق تھا۔

جیلر : کیسی کتابوں کا؟

لڑکی : ہر قسم کی۔ قصے کہانیاں ناول .... مذہبی۔ مگر شاعری زیادہ پسند تھی۔

جیلر : (سوچتے ہوئے) : شاعری!

لڑکی : ہاں۔ بڑے بڑے شاعروں کے شعر یاد کر کے سنایا کرتے تھے ...... انہیں ڈرامے کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ مجھے بھی ڈائیلاگ یاد کرا دیتے تھے؛ اور پھر ہم دونوں .... خیر اب چھوڑیئے ان باتوں کو ....

جیلر : سنو۔ تم نے یہہ بھی سوچا ہے، تم اسے پہچانو گی کس طرح! .... میرا مطلب

ہے ...... اتنے دن بعد، .... اور پھر وہ کبھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اسے پہچانے
وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گا۔ پھر .... کیا کروگی تم !

لڑکی : جی ہاں۔ یہ بات میں نے کبھی سوچی تھی ...... مگر آپ اطمینان رکھیں، اگر وہ میرا بھائی ہے تو میں اسے ضرور پہچان لوں گی۔ میں اسے بچپن کی باتیں یاد دلاؤں گی ......

جیلر : بچپن کی باتیں ...... !

لڑکی : ہاں۔ ہم جب ساتھ کھیلتے تھے، تو وہ مجھے بہت سی کہانیاں سناتے تھے .... جانوروں کی، پرندوں کی .... ایک لمبی کہانی انہیں بہت اچھی آتی تھی .... اور پھر رات کو سوتے وقت، ایک لوری تھی، جو وہ مجھے سناتے اور .... میں ان اور پھر سونے سے پہلے ہم دعا مانگتے تھے ..... بھگوان سے .... انہیں بھگوان اور دھرم کا بہت خیال رہتا تھا۔

جیلر : (بے چینی سے ٹہلنے لگتا ہے) : میں نہیں سمجھتا کہ موہن لال تمہارا بھائی ہے۔

لڑکی : کیوں ؟

جیلر : اسلئے کہ بھگوان اور دھرم کی اسے کوئی بات نہیں معلوم۔ تم کوشش کر دیکھو .... میں اب اسے بلاتا ہوں ..... ہاں۔ ایک بات ——— اگر وہ سچ مچ تمہارا بھائی ہے تو تم اس سے چاہو تو ایک گھنٹے تک باتیں کر سکتی ہو۔ لیکن .... اگر نہیں ہے تو، .... میں چاہتا ہوں تم جلدی واپس چلی جاؤ .... سمجھیں !

[پس منظر میں پیانو کے ہلکے ہلکے سر]

...... (رک کر) کیا بات ہے .... تم اس طرح ......

لڑکی : (جلدی سے) : کچھ نہیں۔ شائد میں کچھ ...... نروس ہوگئی ہوں، اور کوئی بات نہیں۔ اگر وہ میرا بھائی ہے تو ...... یہ سب کتنا عجیب ہوگا .... کتنا دکھ بھرا .... ماں کی کیا حالت ہوگی ! لیکن پھر میں سوچتی ہوں شائد اس طرح ماں دن رات کی بے کلی ...... اور مسلسل انتظار کی آگ سے چھٹکارا پا سکے گی ....

کون جانے ! اب اور دیر مت کیجئے جیلر صاحب ......

جیلر : نہیں - اب دیر نہیں ...... (زور سے) کشن ..... ادھر آؤ ۔

[پیانو کے سر دھیرے ہو کر خاموش ہو جاتے ہیں]

کشن : (آتے ہوئے) : جی صاب ۔

جیلر : کیا وہ سب لوگ ...... تیار ہیں ؟

کشن : جی ہاں ۔

جیلر : (جیسے چونک کر) : اچھا دیکھو ..... ادھر اسسٹنٹ صاحب کے کمرے میں جا کر پنڈت جی اور موہن لال کو یہاں بھیج دو - تم وہیں ..... اسی کمرے میں ٹھہرے رہنا ...... سمجھے ؟

کشن : جی صاب ۔ (جاتا ہے)

جیلر ...... بہت سے کام ہو بیٹی - تم بہت بہادر لڑکی ہو ......

[موہن لال اور پنڈت جی آتے ہیں ......]

..... موہن یہ تم سے ملنے بہت دور ...... ہری پور سے آئی ہیں ...... تم ان سے باتیں کرو ..... میں اور پنڈت جی ادھر دوسرے کمرے میں انتظار کرتے ہیں ...... آئیے پنڈت جی ......

[پیانو کے کئی سر ایک ساتھ گونج اٹھتے ہیں ..... پنڈت جی اور جیلر بائیں ہاتھ والے کمرے میں چلے جاتے ہیں ..... گونج کی جھن جھناہٹ کچھ دیر مکالموں کے دوران بھی برقرار رہے ۔]

لڑکی : (آہستہ سے) : ماں نے بھیجا ہے ...... تم سے ملنے کے لئے ۔

موہن : (بے توجہی سے) : ماں نے !

لڑکی : ہاں ..... ہم لوگوں کو بہت زمانے سے بھیا کی کوئی خبر نہیں ملی .... ہریش بھیّا کی .... میگزین میں تمہارے بارے میں پڑھنے کے بعد ..... ماں نے سمجھا کہ شائد ....

موہن : میں تمہارا ہرلیش بھیّا ہوں۔

لڑکی : ہاں۔

موہن : مگر اب تم نے جان لیا کہ میں نہیں ہوں ..... ہے نا ؟

لڑکی : میں ٹھیک سے نہیں کہہ سکتی ..... اس میگزین کی تصویر کی طرح .... تم بھی کچھ کچھ ویسے ہی لگتے ہو.... یا شائد .... میں غلطی پر ہوں۔ مجھے نہیں معلوم .... اوہ .... کتنے دن ہو گئے ہیں۔ اور پھر ..... میرے ذہن میں جو تصور تھا ..... تم .... تم ویسے نہیں ہو۔

موہن : ہو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ میں ...... تمہارا یا کسی کا بھی بھائی نہیں ہوں۔ میرے کوئی بہن نہیں ہے۔

لڑکی : (آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، آہستہ سے) : یہہ تم سچ کہہ رہے ہو !

موہن : بالکل سچ

لڑکی : (اسی آہستہ لہجے میں) : کیا تم مجھے اپنا ..... اصلی نام بتا سکتے ہو ؟

موہن : موہن لال ...... (پیٹھ کر، دوسری طرف دیکھتے ہوئے) کیا تم سمجھ رہی ہو میں جھوٹ ....

لڑکی : (جلدی سے) : نہیں۔ مجھے یقین ہے تم سچ بول رہے ہو۔ تمہیں ہری پور یاد ہے ؟

موہن : میں نے یہہ نام پہلے کبھی نہیں سُنا۔

لڑکی : تمہیں کتابیں پڑھنے کا شوق ہے ......

موہن : کتابیں !

لڑکی : ہاں ..... ناول، ڈرامے .... شاعری کی کتابیں ....

موہن : جب وقت ملتا ہے تو پڑھتا ہوں ..... یہاں آکر میں نے بہت پڑھا ہے۔

لڑکی : تم نے کبھی کتابوں کا بزنس بھی کیا ہے ؟

موہن : نہیں (کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)۔

[پس منظر میں پیانو کے ہلکے ہلکے سروں کے جھونکے اُبھرتے رہتے ہیں]

لڑکی : (پاس کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ....) : تم بُرا تو نہیں مان رہے ہو... میری باتوں کا۔

موہن : نہیں ــــ بالکل نہیں۔ تم پوچھتی جاؤ.... شائد اس سے تمہارے دل کو شانتی ملے!

لڑکی : تم جب اسکول میں پڑھتے تھے تو..... تمہیں ڈرامے کرنے کا شوق تھا.......
تمہیں بہت سے ڈائیلاگ یاد تھے...... بہت سی نظمیں..... اور کہانیاں
یاد تھیں......

[پیانو کے سروں کا جھونکا سا گذر جاتا ہے۔ لڑکی کی آواز
جذباتی ہوتی جاتی ہے ــــــــــــــــ]

..... الف لیلہ کی کہانیاں...... جانوروں کی کہانیاں..... اور کیا تمہیں
وہ چرواہے کی کہانی یاد نہیں.....؟

موہن : چرواہے کی!

لڑکی : جسے اس کی ماں گھر سے نکال دیتی ہے اور..... ایک پری آکر بادلوں کے دیس
میں لے جاتی ہے..... کیا تمہیں یاد نہیں ہے.... (رک کر) کیا تمہیں کچھ یاد نہیں ہے۔

[موہن خاموش رہتا ہے۔ پس منظر میں پیانو پر بہت دھیمی آواز
میں ایک دُھن، ہلکی لے میں ابھرتی ہے۔ لڑکی اسی دھن میں گنگناتی ہے]

..... دور گگن سے آئی ہے رینا، سوچا، سوچا موند کے نینا۔
..... دور گگن سے آئی ہے رینا..... بتاؤ اس کے آگے کیا ہے!

موہن : (بے چین ہوکر، کھڑا ہوجاتا ہے) : مجھے نہیں معلوم..... اور نہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

لڑکی : (جیسے فیصلہ کرلیتی ہے) : ٹھیک ہے۔ تم پریشان نہیں ہو..... (دکھری
ہوکر، قدم بڑھاتے ہوئے) اب میں جاتی ہوں، میری وجہ سے تمہیں خواہ مخواہ
تکلیف ہوئی۔

موہن : کیا..... کیا تم..... سچ مچ جارہی ہو!

لڑکی : ہاں ــ میں نے وعدہ کیا تھا اگر تم بھیّا نہیں ہو تو فوراً چلی جاؤں گی۔

موہن : کہاں..... ماں کے پاس؟

لڑکی : ہاں۔

موہن : مجھے افسوس ہے، تمہارا آنا بیکار ہوا ..... اتنی دور ..... تمہاری ماں کیوں نہیں آئیں؟

لڑکی : وہ بیمار ہیں ..... (خاموشی) ..... اور ان کی بیماری کی اصل وجہ بھیّا ہی ہیں۔

موہن : (ایک لمحہ خاموش رہ کر، آہستہ سے) : شاید یہ جان کر کہ ان کا بیٹا ہنسی خوشی ہوا ..... ان کی تکلیف کم ہو جاتی کی ....

لڑکی : شاید ..... لیکن میرا خیال ہے، جب تک ہریش بھیّا کا حال معلوم نہ ہو، وہ اچھی نہیں ہونگی۔

[بیک گراونڈ میں پیانو کے تیز اور چبھتے ہوئے سُر]

موہن : (بے چین سا، کرسی سے اُٹھکر ایک دو قدم دور جاکر) : کاش میں ..... میں ان کے کوئی کام آسکتا ..... (پلٹ کر) ہاں۔ تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔

لڑکی : شوبھا ....

موہن : (دہراتا ہے) : شوبھا ..... اور تمہارے بھائی کا نام ہریش ہے!

لڑکی : (حیران ہو کر) : ہاں ..... کیوں؟

موہن : کچھ نہیں۔ میں کچھ اور سوچنے لگا تھا ..... اس لڑکے کا نام بھی کچھ ایسا ہی تھا ..... ذرا ٹھیرو۔ شاید مجھے یاد آگیا ..... ہریش ..... ہریش کمار ماتھر۔

لڑکی : (جلدی سے) : یہی تو ہے ..... بھیا کا نام!

[پیانو کے سروں کی تیز جھن جھناہٹ]

موہن : ..... تو پھر ذرا ٹھیر جاؤ ..... ابھی مت جاؤ ..... بیٹھ کر میری پوری بات غور سے سنو ..... وقت بہت کم ہے۔ (کرسی پر بٹھا دیتا ہے) ..... اور یہ ساری باتیں تمہیں جاکر ماں کو بھی سناتی ہیں ..... سمجھیں؟ ..... اس لئے دھیان سے سنو۔ پچھلے دنوں میں فوج میں تھا، اور ہماری ڈیوٹی ہمالہ کی برفانی سرحدوں پر تھی ..... دن دن بھر ہم خندقوں میں چھپے دشمن پر گولیاں برساتے رہتے ..... ایک دن ہم نے آگے بڑھ کر حملہ کیا اور پھر اپنے مورچوں پر واپس آگئے۔

گولیوں کی بوچھاڑ میں ہمارا ایک افسر زخمی ہو کر گر پڑا ...... (ایک لمحہ رک کر)
وہ خطرے میں گھرا ہوا تھا ...... تب ہماری خندق سے ایک نوجوان نکلا اور
گولیوں کی بارش میں بڑھتے ہوئے جا کر افسر کو ہاتھوں میں اٹھا لیا ...... لیکن
جب وہ اسے لئے ہوئے واپس آ رہا تھا ...... تو بہت قریب ہی ایک گرینیڈ آکر
گرا اور ...... اور وہ دونوں ختم ہو گئے ...... نوجوان کا نام ہرشن کمار ماتھر تھا۔

لڑکی : (آہستہ سے، بھرائی ہوئی آواز میں) : ...... تو ...... بھیا ...... ہرشن بھیا ...... (سسکی)

موہن : ہاں تم جا کر ماں سے کہہ دو کہ ...... ان کا بیٹا میدان جنگ میں بہادری کی موت مرا
ہے ...... افسوس کہ کسی کی اس بہادری پر کسی نے توجہ نہیں دی ......
ورنہ تمہاری ماں کو انعام میں تمغہ دیا جاتا ...... مگر جنگ میں ایسا ہوتا ہی ہے۔

لڑکی : اور ...... اور یہ سب ...... تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ؟

موہن : ہاں۔ اس بات کو تین برس ہو گئے۔ اور یہی وجہ ہے تمہیں اتنے دن سے اس کی کوئی
خبر نہیں ملی ...... تمہیں یقین نہ ہو تو ڈیفنس منسٹری کو لکھ کر پوچھ لو، وہ کون سی
بٹالین میں تھا ...... (رک کر) اتنے دن ہو گئے ہیں، ہو سکتا ہے وہ لوگ
تمہیں ٹھیک نہ بتا سکیں ...... یہ بھی ہو سکتا ہے، کہہ دیں، اس نام کا
کہیں پتہ نہیں ہے ...... ایسا ہوتا رہتا ہے، لیکن تم اس پر یقین نہ کرنا ......
میں جو کچھ تمہیں بتا رہا ہوں، وہی حقیقت ہے ...... (رک کر، کچھ دور جا کر)
اور جب تمہاری ماں کو پتہ چلے گا کہ ان کا بیٹا مجرم کی موت نہیں، ایک بہادر سپاہی
کی موت مرا ہے تو ...... تو ان کے دکھی دل کو کتنی خوشی ملے گی ...... ہے نا!
اور ...... اور کیا یہ جان کر تمہیں خوشی نہیں ہوئی ؟

لڑکی : (جیسے چونک کر) : جی ؟ ...... ہاں ...... ہاں ...... (آواز بھرا جاتی ہے) ...... بہت خوشی۔

موہن : ایک چیز اور رکھی ہے، جو تمہیں جا کر ماں کو دینی ہے ...... (جیب سے چیک
نکال کر) ...... یہ چیک۔ میں نے اسے لفافے میں بند کر دیا ہے۔ ماں سے
کہنا وہی اسے کھولے۔

لڑکی : لیکن .... لیکن یہ کس لئے ! ....

موہن : میں ...... میرے پاس اس وقت اس کے سوا، اور کچھ نہیں ہے .... (دیتے ہوئے) نہیں، نہیں .... رکھ لو اسے۔ اگر اس وقت میری بجائے تمہارے ہریش بھیاّ ..... یہاں ہوتے، اور وہ تمہیں یہ دیتے .... تو کیا تم نہیں لیتیں ؟ .... ماں سے کہنا ایک چھوٹا سا لاکٹ بنوا لیں .... جو ہمیشہ تمہاری اس خوب صورت گردن میں پڑا رہے ......

لڑکی : ... اچھی بات ہے .... لیکن وہ شائد ... بھیا سے زیادہ تمہاری یاد دلاتا رہے گا۔

موہن : نہیں۔ ایسا مت کہو ..... اپنے بھائی کے ساتھ مجھے مت ملاؤ ... میں اس قابل نہیں ہوں۔

[پیانو کے سر دھیرے دھیرے ابھرتے ہیں]

(رک کر) ...... اچھا ...... (جیسے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) میں سمجھتا ہوں .... اب تمہاری روانگی کا وقت ہو چکا ہے ...... تمہیں چلا جانا چاہیئے ..... میں خوش ہوں کہ تم مجھ سے مل لیں۔

لڑکی : (رندھی ہوئی آواز میں) : مجھے نہیں معلوم ...... اس وقت؛ تم سے جدا ہوتے ہوئے مجھے کیا کہنا چاہیئے ! تم نے مجھ پر، اور ماں پر جو احسان کیا ہے، میں اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکی۔ کاش میں بھی تمہارے لئے کچھ کر سکتی ...... کوئی خوشی دے سکتی تمہیں .... بتاؤ میں کچھ کر سکتی ہوں تمہارے لئے ....

[پیانو کے سُر اونچے ہو کر ڈوب جاتے ہیں]

موہن : (آہستہ سے) : ہاں .... کر سکتی ہو۔

لڑکی : (چونک کر) : ———— کیا !

موہن : (جلدی سے) : .... کچھ نہیں ...... اب جانے دو۔

لڑکی : نہیں ...... بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں ..... (بے چین ہو کر) .... بھگوان کے لئے ...

موہن : (آہستہ سے) : میرے قریب آجاؤ ...... (دونوں قریب آجاتے ہیں، موہن لڑکی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چومتے ہوئے) .... تاکہ میں تمہارے

ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر، انہیں چوم سکوں ..... انہیں پیار کر سکوں ...
(آواز، تیز سانسوں میں الجھ جاتی ہے) اوہ .... آج کی رات میں کتنا اداس
اور تنہا تھا! .... تم نہیں جانتیں، میں نے یہ دن کس عذاب میں گذارے ہیں:
..... پچھلے پانچ مہینے سے اکیلا اپنے کمرے میں بند رہا ہوں۔ میں نے سوچا بھی
نہیں تھا کہ تم .... جیسی لڑکی سے ملاقات ہو سکے گی۔ میں بھول چکا تھا کہ عورت
اور فرشتے میں کتنا کم فرق ہوتا ہے ...... تم آج نہ آتیں تو .....

[پس منظر میں دھیمے سروں کی لہریں]

تو کتنی کمی رہ جاتی! اور پھر ...... میرا اپنا تو کوئی بھی نہیں، جو ...... مجھے بدا
کرنے آتا! .... نہیں۔ ان آنسوؤں کو پونچھ ڈالو ...... اور جانے سے
پہلے ایک بار مجھے مسکرا کر دیکھو .... (ایک دو لمحے کا وقفہ۔ موہن لڑکی کا چہرہ
اوپر اٹھا کر، آنسو پونچھتا ہے) ..... جاؤ۔ اب تم چلی جاؤ۔

لڑکی : (رندھی ہوئی آواز میں) : بھگوان تمہاری مدد کرے۔

موہن : سنو۔ تم نے ابھی کسی لوری کے بول سنائے تھے ...... کیا تم ..... ایک بار،
جاتے ہوئے انہیں پھر ..... سنا سکتی ہو؟

لڑکی : (ہلکا سا وقفہ) : وہ .... وہ مجھے بھیّا رات کو سوتے وقت سنایا کرتے تھے ....
مگر .... مگر تمہیں تو معلوم بھی نہیں، اس کے آگے کیا ہے!

موہن : کوئی بات نہیں .... تم سناؤ۔

[ایک دو لمحہ کا وقفہ۔ جس کے بعد بہت دھیمے سروں میں لڑکی
لوری کے بول گنگنانا شروع کرتی ہے۔ پس منظر میں پیانو
کے دھیمے سروں میں سنگت]۔

دور گگن سے آئی ہے رینا
سوجا سوجا موند کے نینا ——— (ہلکی سی سسکی)
دور گگن سے آئی ہے رینا

[لڑکی مڑکر جاتے ہوئے گاتی رہتی ہے ..... آواز دُور ہوتی
جاتی ہے] ...... سوجا سوجا موند کے نینا .....
..... سوجا سوجا موند کے نینا .... (بہت دھیمی سِسکی)
[لڑکی کے جانے کے بعد بھی پیانو کے سروں پر وہی دھن
جاری رہتی ہے ــــــ صرف آواز دھیمی ہوجائے
موہن اسی طرف دیکھتا رہتا ہے، جس دروازے
سے لڑکی گئی ہے ــــــــــــــــــــ]

موہن : (ایک لمبا سانس لے کر، سرگوشی کے لہجے میں) : جاؤ..... تم ہمیشہ خوش رہو۔
[اب پیانو پر اسی دُھن کے سُر (اسٹرڈکس) پھر اُبھرتے ہیں۔
موہن اسی دھن کو جاری رکھتے ہوئے آہستہ سے گانا شروع
کرتا ہے ..... آواز بتدریج بلند ہوجاتی ہے۔]
..... رات کا کاجل آنکھ میں مل کے .... پریوں کی نگری سے چل کے
میٹھے سپنے لائی ہے ریتا
سوجا، سوجا موند کے نینا
[پیانو کے سُروں (اسٹرڈکس) کی گونج میں یہ مصرعہ دہراتا ہے]
...... سوجا، سوجا موند کے نینا ....
(اب آواز دھیمی ہوجائے) .... دُور گگن سے آئی ہے ریتا ....
[اس دوران میں، خاموشی سے جیلر اور پنڈت جی آکر موہن کے پیچھے کھڑے
ہوجاتے ہیں۔ اور اسسٹنٹ جیلر بائیں جانب کے دروازے پر سے پردا ہٹا کر
چپ چاپ کھڑا ہوجاتا ہے ــــ پردہ ہٹتے ہی اندر کمرے میں، تیز روشنی کے
حلقے میں پھانسی کا پھندا نظر آتا ہے۔ موہن آہستہ آہستہ اس دروازے کی طرف
قدم بڑھاتا ہے۔ پیچھے پیچھے جیلر اور پنڈت جی خاموشی سے آتے ہیں۔ لوری
کی آواز دھیمی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن جاری رہتی ہے۔ پھانسی والے دروازے

کے سامنے پہنچ کر موہن ایک لمحے کے لئے رک کر سر اوپر اٹھا کر دیکھتا ہے ....

اسی لمحے سارے اسٹیج پر اندھیرا پھیلنے لگتا ہے، اور بڑی تیزی سے بڑھ کر ہر چیز کو اپنے میں جذب کر لیتا ہے۔

[پیانو کے بہت ہلکے سروں میں موہن کی آواز آتی رہتی ہے ———]

.... سوچا .... سوچا .... سوچا ......

[موہن کی آواز پیانو کے سروں میں ڈوب جاتی ہے۔ اور اب کچھ دیر پیانو کے سُر بلند ہو کر، فضاء کو جھنجھوڑ دیتے ہیں ———————]

▲▲

(اس ڈرامے کا مرکزی خیال HAROLD E. PORTER اور ROBERT MIDDLEMASS کے ڈرامہ VALIENT سے ماخوذ ہے)۔

یگ یگ کی پیاس
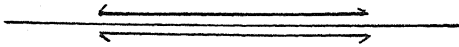
(ایک ایکٹ ــــــــ ایک سین)

افراد :

۱ - عورت

۲ - مرد

اس کے علاوہ کچھ مرد اور عورتیں

[ــــــ ریگ زار کا چٹیل میدان - ایک آدھ سوکھی اور ٹھیٹری ہوئی سی جھاڑی کا ٹھنٹھ - درمیان میں ایک ببول کا سوکھا درخت - جسکے پتے جھڑ چکے ہیں - صرف کانٹے اور سوکھی ٹہنیاں رہ گئی ہیں - اسکے تنے سے پیٹھ لگائے عورت بیٹھی ہے - سر پیچھے کو کئے، جیسے سستا رہی ہو - آنکھیں بند ہیں - پاس ہی ایک لکڑی کا چھوٹا سا صندلی صندوقچہ کھلا ہوا رکھا ہے، اندر سے خالی ہے - عورت کی گود میں کپڑے کی بنی ہوئی ایک بڑی گڑیا رکھی ہے -

درخت کے قریب ہی ایک پتھر پڑا ہے، جس پر ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے۔

منظر کھلنے سے پہلے ہی سے بانسری پر چندر کونس میں دھیمی لے میں کوئی دھن شروع ہوجاتی ہے - سنگت میں طبلے کی بجائے گھنگھرو کی بہت ہلکی ہلکی آواز آتی رہتی ہے ـــــ

دائیں جانب سے آدمی آکر درخت کے قریب کھڑا ہوجاتا ہے اور ہاتھ کی لکڑی (عصا)، اور سر پر کی پگڑی اتار کر پتھر پر رکھدیتا ہے - عورت گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی ہے - اور گڑیا کو ہاتھوں میں بھینچ لیتی ہے -

بانسری اور گھنگھرو کی آوازیں دھیمی ہو کر تقریباً غائب ہو جاتی ہیں۔۔

______ عورت کی عمر ۴۵ سے ۵۵ برس تک کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ لباس سادہ اور گرد میں اٹا ہوا، ہر جگہ شکنیں اور دھبے۔ سر کے بال بھی ہوا اور دھول میں الجھ گئے ہیں۔ اس کے باوجود چہرے کے خدوخال دیکھنے والے کو متاثر کرتے ہیں۔

______ آدمی زیادہ عمر کا ہے (ساٹھ سے ستر برس تک)۔ معمولی کھدر کا ______ کرتا اور دھوتی پہنے ہے۔ وضع قطع سے دیہاتی سا لگتا ہے۔

● ...... اس پورے سین کے دوران تھوڑی تھوڑی دیر سے، ریگستان میں چلنے والی ہواؤں اور بگولوں کا بے ہنگم شور ابھرتا رہتا ہے ______ ۰]

مرد : ڈرو نہیں .... میں انمیں سے نہیں ہوں۔

عورت : یہاں کیوں آئے ہو ؟

مرد : تم یہاں کیا کر رہی ہو ؟ .... رک کیوں گئیں ؟

عورت : (ذرا سا رک کر) : تھک گئی تھی۔

مرد : مگر پہاڑ تو ابھی دور ہے ...... بہت دور جانا ہے۔

عورت : پتہ ہے .... میں رکی نہیں ؛ سستا رہی ہوں۔ دھوپ بہت تیز ہے نا۔

مرد : ______ مگر ..... اس پیڑ کے نیچے ؟!

عورت : اس کا سایہ بہت ٹھنڈا لگ رہا ہے۔

مرد : (حیران سا) : سایہ ؟ ... کون سا سایہ ؟!

عورت : یہی .... (ہاتھ سے اشارہ کر کے) تم بھی سستا لو اس ٹھنڈک میں ..... تیز دھوپ میں آ رہے ہو۔

مرد : ٹھنڈک ! ..... اس کے تو پتے بھی جھڑ چکے ہیں۔

عورت : دھوپ نے تمہاری بینائی چھین لی ہے ..... تم پہاڑ تک کیسے جاؤ گے !

مرد : تمہارے ساتھ ۔ اسی مارے اتنی دور سے پیچھے پیچھے آرہا ہوں ۔

عورت : تو پھر بیٹھ جاؤ...... کچھ دیر........ ابھی بہت فاصلہ ہے ۔

[مرد پتھر پہ بیٹھ جاتا ہے]

پیڑ کے سائے کو سورج کی روشنی کی ضرورت نہیں .... وہ رات کے

اندھیرے میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا ....

[عورت گڑیا کو دونوں ہاتھوں کے جھولے میں پکڑ کر جھلاتی

ہے ۔ پس منظر میں ذیل کے بول ابھرتے ہیں ..... دُھن

وہی ہے جس میں ہریانے کے برج کے علاقے کے بچے یہہ

گیت نیل کنٹھ کو دیکھ کر کھیل میں گاتے پھرتے ہیں ــــ

"نیل کنٹھ تو نیلا رہیو ــــ میری بات خدا سے کہیو ۔

سوتے ہوں تو جگا کے کہیو ــــ جاگت ہوں تو کان میں کہیو ۔"

عورت بچوں کی طرح خوشی سے کھل جاتی ہے ۔ پھر

یکایک جھلانا بند کر کے گڑیا کو گود میں بھینچ لیتی ہے ۔

اور خوف زدہ ہو کر اوپر درخت کی طرف دیکھتی ہے ۔]

عورت وہ نیل کنٹھ کیوں اڑ گیا ! .... کہاں گیا ؟

مرد : کون سا نیل کنٹھ ؟ .... کونسا ہُد ہُد ؟...اس ــــ ویرانے میں

پنکھ پکھیرو کہاں ــــــــ ؟

عورت مگر وہ تھا ــــــــ وہاں، پتوں میں چھپا بیٹھا تھا ...... تم نے

نہیں دیکھا ؟

[مرد خاموش اسے تکتا رہتا ہے ۔ پس منظر میں ہواؤں اور بگولوں کی

ماتمی آوازیں ابھرتی ہیں ۔ روشنی زرد اور مدھم پڑ جاتی ہے ۔ جیسے

ریگستان کی ریت اڑ رہی ہو ۔ ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ اب سازوں

کے بے ہنگم سر ابھرتے ہیں جو بتدریج اونچے اور گرجدار ہوکر سارے اسٹیج پر چھا جاتے ہیں - ایسے میں کچھ مرد اور عورتوں کے ہیولے (کم از کم چار مرد اور چار عورتیں) اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں - اور چند سکنڈ اِدھر اُدھر بے مقصد گھومتے ہیں - جیسے کچھ تلاش کر رہے ہوں - پھر جیسے غیر شعوری طور پر پس منظر کے سازوں کی لے پر رقص (بیلے) شروع کر دیتے ہیں - رقص کی لے تیز ہوتی جاتی ہے - یہہ لوگ ناچتے ہوئے عورت اور مرد کے قریب بھی آتے ہیں - لیکن یوں گذر جاتے ہیں جیسے انہیں دیکھا ہی نہیں - رقص سے انسان کے اندرونی کرب اور پیاس کا اظہار ہوتا ہے -

سازیکایک بند ہو جاتے ہیں - اور یہہ لوگ زمین پر گر کر، رینگتے ہوئے اسٹیج کے باہر چلے جاتے ہیں -]

عورت : یہہ کون لوگ ہیں ؟ ...... کہاں جا رہے ہیں ؟

مرد : کہیں بھی نہیں ...... بھٹکتے پھر رہے ہیں ..... جانے کب سے -

عورت : مگر ان کے چہرے دیکھے ... ؟ کتنے بھیانک ..... کتنے اداس، سوکھے - سوکھے ..... پیلے پیلے ......

مرد : اس پیڑ کے سارے پتے ...... جو کبھی کے مُرجھا کر گر چکے ہیں - اور بگولوں میں ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں ..... ہر طرف، ریگ زاروں ......

عورت : مگر اس پیڑ کے پتے .... گرے کہاں ہیں ؟!

مرد : (حیران سا، کچھ دیر عورت کو چپ چاپ تکتا رہتا ہے) : تم کون ہو؟..... اب تک کہاں تھیں ؟ ..... کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں لوگ ؟

عورت : کون لوگ ؟

مرد : یہی جو دھرتی کے دہکے ہوئے توے پر بُھنتی ہوئی چیونٹیوں کی طرح ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں -

عورت : انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا ؟

مرد : کیسے دیکھیں ؟ .... میں تو برسوں سے ...... (رک جاتا ہے) اور تم ...... کب سے کھڑی دھوپ میں بکھر رہی ہو، جنم جنم کے دکھوں کا بوجھ سر پہ اٹھائے ! ...... موم کی طرح پگھل پگھل کر شفاف بن چکی ہو... اب کون دیکھ سکے گا تمہیں ؟

[عورت گڑیا کو صندوقچے میں رکھکر بند کر دیتی ہے]

مرد : اس کی کیا ضرورت ہے ؟

عورت : یہہ میرا بچپن ہے ..... سارا جیون ہے .... اسی کی شکتی پر جی رہی ہوں ۔

مرد : تم وہاں سے بھاگ کیوں آئیں ؟

عورت : تم وہاں تھے ؟

مرد : نہیں ۔ میں سامنے کھنڈر میں تھا ۔

عورت : وہاں بھیڑ بہت تھی ۔

مرد : بھیڑ ———— (ہنستا ہے)

عورت : ہر طرف، .... لوگ ہی لوگ .... چہرے ہی چہرے .....

مرد : تم ڈر گئیں ! ..... وہ خود ڈر کر آئے تھے ..... ہر ایک کا ڈر ساتھ ہوتا ہے .... اپنے اپنے کلیان کے لئے آتے ہیں ۔

عورت : کیا درشن سے کلیان ہو جاتا ہے ؟

مرد : (کچھ دیر چپ رہتا ہے) : کس کا کلیان ؟ ..... آتما کا ..... یا شریر کا ؟

عورت : شانتی مل جاتی ہے ؟

مرد : مجھے اب تک نہیں ملی ......، کتنے برسوں سے کھڑا ہوں ان کھنڈروں میں، ...... ہر پل، ہر آن ...... درشن ۔ مگر ..... تم نے تو کئے ہوتے درشن .... کون جانے پہاڑ تک جانے کی ضرورت نہہ پڑتی ۔

عورت : نہیں ...... لوگ ہی لوگ ......
(خوف زدہ سی ہو کر) .... آنکھیں ہی آنکھیں .... آگ ہی آگ ۔

.... (رک کر، مرد کی طرف دیکھکر) اور پھر، ...... دیشن

کے کہیں دام لگتے ہیں ؟

[مرد اٹھکر ٹہلنے لگتا ہے]

مرد : تم سے کس نے بتایا کہ پہاڑ پر .... روشنی ملے گی ....

عورت : اس بھیڑ میں .... میں چکرا گئی تھی، ...... گر گئی تھی ۔ کسی نے میرے

کان میں آکر کہا کہ ..... (رک کر) مگر وہ تو تمہاری آواز تھی !!

مرد : .... میں تو برسوں سے کہہ رہا ہوں ...... سنتا کون ہے ؟

عورت : خود کیوں نہیں چلے گئے ؟ ......، سب ہی کو انتظار ہے ۔

مرد : برسوں سے کھڑے کھڑے میرے پاؤں بیکار ہو گئے تھے ..... ہر ایک کی

طرف دیکھتا تھا ...... وہ آگ، وہ شکتی ..... تمہاری آنکھوں میں ہے

جس کی مجھے ضرورت تھی ۔ اور پھر ..... تم پگھل کر کندن ......

بن چکی ہو .... تمہارے پیچھے پیچھے میں بھی ..... (خاموش ہو جاتا ہے)

عورت : (اپنے آپ میں کھوئی کھوئی سی ٹہلنے لگتی ہے) ...... پر میں .... وہاں تک

جا سکوں گی ؟ .... نربل .... اشانت ..... ناری !؟

مرد : ناری بہت بلوان ہوتی ہے ...... راکششوں پر وجے پانے کے لیے وشنو جی کو

موہنی کا روپ دھارنا پڑا تھا ....

عورت : پر ان کی سواری کیلئے گروڑ تھا ......

مرد : کون جانے تمہاری اڑان کیلئے بھی کوئی پکھیرو آجائے ..... ان جانا .... ان دیکھا

عورت : یہاں ؟ ..... اس تپتے ہوئے سناٹے میں ؟ ..... ریت کے جھکڑوں میں ؟

مرد : .... سوکھے ببول کے ٹھنٹ نے تمہیں سایہ دیا ۔ اس میں تمہیں نیل کنٹھ

نظر آیا .... تم ان میں سے نہیں ہو ۔

عورت : تم مجھے جانتے تک نہیں .....

مرد : تم عورت ہو، اور بس .... یہی اصل ہے ..... روشنی، ہوا ....

ساری زندگی تمہارے دم سے ہے ....

[عورت بے چینی سے ٹہلتی ہے]

عورت : میرا پتی ہے .... بچے ہیں۔

مرد : میرا بھی ایک بیٹا تھا۔

عورت : مگر اب ...... اب صرف ایک آتما ہو ...... برسوں سے۔

مرد : اور تمہاری آتما کا چین کھو گیا ہے ......

عورت : (رک کر، مرد کی طرف دیکھکر) ...... تمہارے بیٹے نے ...... ؟

مرد : (اثبات میں گردن ہلاتا ہے، چُپ چاپ) : بیٹا ...... پتی ...... کوئی اپنا نہیں ...... کوئی رشتہ نہیں ...... سب جھوٹ ہے .... بس عورت ہوتی ہے یا مرد۔

عورت : نہیں ...... آتما ...... صرف آتما۔

مرد : جو تم کھو چکی ہو۔

عورت : (مضطرب ہوکر) : نہیں - صرف چین - آتما کا چین - مگر تم شریر کھو چکے ہو۔

مرد : کِس کِس کی بات کروگی ؟ ...... سب ہی اشانت ہیں ...... سب ہی راستہ ڈھونڈھ رہے ہیں - شریر جن کی آتمائیں نہیں ہیں، اور آتمائیں جن کے شریر کھو چکے ہیں۔

عورت : مگر وہ ...... چمکیلی آنکھوں اور موہنی صورت والے بوڑھے بابا کبھی تو ادھر سے گذرے ہوں گے، ...... جن کی سفید ڈاڑھی سے سویرے کی کرنیں پھوٹتی ہیں ...... چھپی ہوئی پگ ڈنڈیاں اُبھر آتی ہیں۔

مرد : برسوں کھنڈر میں انتظار کرنے کے بعد ایک دن میں نے وہ کرن پالی .... وہ پگ ڈنڈی اسی پہاڑ کی طرف جاتی ہے۔

عورت : تو پھر ...... یہہ لوگوں کا ہجوم ...... بھٹکنے والی آتماؤں کی بھیڑ ...... ؟ وہ کرن ...... وہ پگ ڈنڈی انہوں نے نہیں دیکھی ؟

مرد : ساگر میں ہر سیپ تو موتی نہیں اگل سکتی .... تم اپنی بات کرو۔
[عورت صندوقچہ کھول کر گڑیا نکالتی ہے، اور بائیں جانب دیکھتی ہے]

عورت : مجھے جانا ہے ...... میں جاؤں گی ...... سنو، گھنٹیوں کی آواز ....
...... دُور دیو کنٹھ سے آ رہی ہے .... مجھے بلا رہی ہیں ...

مرد : مگر یہہ .... پچھلا جیون نہیں ..... اس پیڑ کے نیچے ..... چھوڑ دینا ہوگا
...... اسی پیڑ کی امٹ چھاؤں میں ——
[عورت کچھ دیر خاموشی سے گڑیا کو دیکھتی رہتی ہے - پھر اسے
صندوقچے میں رکھکر بند کر دیتی ہے، اور اٹھ کر کھڑی ہو جاتی
ہے، جیسے چلنے کے لیے -]
تمہاری یہہ شکتی مجھے بھی وہاں لے جائے گی۔

عورت : مگر، تم .... میرے ساتھ ....

مرد : کوئی رشتہ نہیں .... صرف مرد .... عورت ! ..... جانے کب سے ...
کتنے برسوں سے کھنڈروں میں کھڑا تھا۔ کسی نے میری بات نہیں سنی - نہہ
مرد نے .... نہہ عورت نے .... صرف تم میں شکتی ہے ....
[اضطراری انداز میں ٹہلتے ہوئے، جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہے
.... چند سکنڈ رک کر بائیں جانب دیکھتا ہے]
.... پگ ڈنڈی چٹیل ریگزار میں گم ہوتی جا رہی ہے ... آگ کی لہریں
دھرتی کے سینے سے یوں اٹھ رہی ہیں جیسے اژدہے پھنکاریں مار رہے ہوں
...... سناٹا .... صرف سناٹا ! ...... چیل اور کوے بھی نہیں
...... اور ایک ریگ زار کے بعد، دوسرا .... مگر یہی ہے پہاڑ
کا راستہ ——
[عورت مضطرب سی ہو کر کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر مرد ہاتھ سے روک دیتا ہے]
.... جگہ جگہ تمہیں انسانی ڈھانچوں کے پنجر ملیں گے ..... یا شائد

وہ بھی نہیں ۔ صرف سیاہ دھبے ...... ڈراونے کالے داغ ملیں گے ۔ ان
کے جو سچائی کی کھوج میں گئے تھے .....

عورت : انہوں نے ...... آواز سنی تھی ؟

مرد : شائد ..... مگر پہنچ نہیں سکے ..... اونچی بستیوں کے ویرانے میں ان کے شریر
کھوکھلے ہو گئے تھے ..... راستے کی جلتی ہوئی دھوپ کی زبانیں انہیں .....
چاٹ گئیں ـــــ

عورت : ہر سیپی کے پیٹ میں موتی نہیں ہوتا ـــ

مرد : مگر تم .... تمہیں جانا ہوگا ...... سیاہ دھبوں میں سے ۔ اور تمہارے
پیچھے پیچھے میں ....

عورت : (درمیان میں) : پیچھے پیچھے کیوں ـــــ ؟

مرد : تم جس سائے میں بیٹھی تھیں ، وہ میں نہیں دیکھ سکا ..... کوئی ....
نہیں دیکھ سکتا ـ (وقفہ)

عورت : .... کیا وہ وہاں آئے گا ؟

مرد : آئے گا ۔

عورت : مکتی کا راز لے کر ؟

مرد : مکتی کا راز لے کر ۔

عورت : پہاڑ کا سینہ چیر کر ؟ .... اور اگر وہاں پہاڑ ہی نہ ہوا تو ـــ ؟

مرد : (بیچ کر) : نہیں ۔ ایسا مت کہو .... بوڑھے بابا نے کہا تھا.....
...... پہاڑ ہے ۔ وہ وہاں آئیگا ...... کون جانے آچکا ہے ـــــ
ہم ہی کو دیر ہو گئی ہے ۔

[پس منظر میں وہی شروع کی چندر کونس کی دُھن بانسری پر
ابھرتی ہے ـــــ بہت دھیمی آواز میں ، جو دھیرے
دھیرے تیز ہو جاتی ہے ۔ گھنگھرو کی سنگت برقرار رہتی ہے]

عورت : اگر میں بھی پگ ڈنڈی کا سیاہ دھبہ بن گئی تو ...... !

مرد : تمہیں کچھ نہ ہوگا .... تم نے ساگر کا ...... نہیں، تمام جہاں کا سارا زہر پی لیا ہے .... تم نیل کنٹھ ہو .... تمہیں جانا ہی ہوگا۔

[عورت آہستہ آہستہ جا کر صندوقچہ کھولتی ہے۔ اور گڑیا کو نکال کر کھلے ڈھکنے پر رکھ دیتی ہے۔ ایسے کہ بہ آسانی نظر آسکے۔ کھڑے ہوتے ہوئے کہتی ہے ——]

عورت : نہ جا سکی تو —— ؟

مرد : تو پھر .... وہی کھنڈر .... زرد غبار .... بھیانک چہروں کا ہجوم .... وہیں چلا جانا ہوگا، واپس .... پیاسا ... اور .... اور پھر وہی انتظار۔

[عورت گڑیا کو چند سکنڈ چپ چاپ دیکھتی ہے۔ اور پھر مڑ کر بائیں طرف چلی جاتی ہے۔ اسٹیج پر روشنی کم ہونے لگتی ہے۔ مرد آکر صندوقچے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس دوران، پس منظر میں گھنگھرو کی آواز بند ہو جاتی ہے اور اب بانسری کی سنگت میں، دوسرے سازوں کے ساتھ، ہلکی لے میں وہی بول ابھرتے ہیں ......

نیل کنٹھ تو نیلا رہیو ⁖ میری بات خدا سے کہیو۔
سوتے ہوں تو جگا کے کہیو ⁖ جاگتے ہوں تو کان میں کہیو۔

اندھیرا بڑھ جانے پر مرد بھی چونک کر، جلدی سے بائیں طرف باہر چلا جاتا ہے، عورت کے پیچھے۔
اسٹیج پر اب اندھیرا پوری طرح چھا جاتا ہے۔
نیل کنٹھ والا گیت، سازوں کی سنگت میں اور ابھر کر دیر تک جاری رہتا ہے۔]

▲▲

سائے کی موت

(RUPERT BROOKE کے ایک ڈرامے سے متاثر ہو کر۔)

کردار

وجے ــــ دل کش اور معصوم خدوخال کا نوجوان

گوری ــــ خوبصورت چہرے اور صحت مند جسم والی گاؤں کی ایک الھڑ لڑکی

دینا ــــ گوری کا باپ، عمر کوئی پچاس برس گٹھے ہوئے جسم کا اجڈ دیہاتی

ماں ــــ گوری کی ماں، ادھیڑ عمر، چہرے سے سختی اور محنت کے آثار نمایاں

چوکیدار ــــ ایک ادھیڑ عمر کا دیہاتی

جیتو ــــ گاؤں کا ایک شرابی

مقام: گھنے جنگلوں اور اونچے پہاڑوں میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤں

سیٹ (SET) کی ترتیب پہلے اور دوسرے منظر میں مختلف ہے

تیسرے اور چوتھے منظر میں ترتیب وہی ہے جو دوسرے منظر میں ہے

پہلا منظر

کسی پہاڑی مقام پر ڈاک بنگلے کا ایک کمرہ۔ صبح کا مل گجا اجالا پھیلا ہوا ہے، جس میں کمرہ کا مختصر سا فرنیچر نظر آتا ہے۔ بائیں دیوار سے لگی ہوئی ایک سنگھار میز، دو ایک کرسیاں، ایک آرام کرسی سامنے بیچ کی دیوار کے ساتھ لگا ہوا ایک پلنگ اور پلنگ کے پاس ہی رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی تپائی، تپائی پر کسی انگریزی اخبار کے کھلے ہوئے صفحے بکھرے پڑے ہیں۔ پلنگ کے نیچے بوٹ اور سلیپر رکھے ہوئے ہیں۔ پلنگ پر معمولی سا بچھونا ہے جس پر سر تک بلینکٹ اوڑھے وجے سو رہا ہے۔ دائیں طرف

دروازے پر کوئی کھٹکھٹاتا ہے، دو تین بار کھٹکھٹانے پر وجے جاگتا ہے۔ بلینکٹ ہٹا کر پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے۔ آنکھیں مل کر پلنگ سے نیچے اتر آتا ہے اور سلیپر پہن کر کرسی پر سے گون اٹھا کر پہننے لگتا ہے، جسم پر سلی پنگ شرٹ اور پاجامہ ہے ...... اس دوران میں باہر سے پھر کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے۔ ساتھ ہی چوکیدار باہر سے کہتا ہے)۔

چوکیدار : حضور .... جاگیے حضور

وجے : (گون پہنتے ہوئے اندر سے) کون ؟ ...... کون ہے اس وقت ؟

چوکیدار : میں ...... میں ہوں حضور چوکیدار۔

وجے : او، چوکیدار ! ...... کیوں کیا بات ہے ؟

چوکیدار : اب اٹھیے حضور۔ صبح ہو گئی ...... آپ نے کہا تھا نا کہ صبح ہوتے ہی جگا دوں۔

وجے : ہاں ٹھیک ہے ...... ٹھہرو میں آ رہا ہوں۔

(جا کر دائیں طرف کا دروازہ کھولتا ہے۔ ساتھ ہی کمرے میں روشنی پھیل جاتی ہے اور چوکیدار اندر آ جاتا ہے، چوکیدار کے جسم پر میلی سی دھوتی، کھدر کا کرتہ اور سر پر پگڑی بندھی ہے، ادھیڑ عمر کا آدمی ہے، ہاتھ میں چائے کا ٹرے لیے ہوئے ہے۔ وجے دروازے کے پاس ہی کھڑا ہے ....)

وجے : (ایک لمبا سانس لے کر) اوہ ! کتنی خوبصورت صبح ہے !

چوکیدار : چائے لے آیا ہوں حضور۔ (ٹرے تپائی پر رکھ دیتا ہے)

وجے : (اپنی دھن میں) یہاں سے یہ سارا منظر کتنا بھلا معلوم ہو رہا ہے !

چوکیدار : چائے جلدی پی لیجے۔ ہوا بہت ٹھنڈی اور تیز چل رہی ہے۔

وجے : (واپس آ کر پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے، چائے بناتے ہوئے) گھنے جنگل میں اونچے اونچے درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے درمیان، اس خوبصورت وادی میں تمہارا یہ ڈاک بنگلہ کتنا خوبصورت دکھائی دیتا ہے، جانتے ہو چوکیدار ؟ ________ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سب کسی بہت بڑے جادوگر کے سحر کا نتیجہ ہے !

چوکیدار : شاید یہ جادو ہی ہے حضور۔ یہاں جو کوئی آتا ہے، ان پہاڑوں اور جھرنوں میں کھو سا

جاتا ہے...... کسی کا دل واپس جانے کو نہیں چاہتا۔

وجے : میں بھی تو یہاں آکر جیسے سب کچھ بھول گیا ہوں..... کتنے دن ہو گئے، ابھی تک جی نہیں بھرا!

چوکیدار : تو کیا حضور...... آج بھی رک جانے کا خیال ہے؟

وجے : نہیں آج نہیں رکوں گا۔ آج بہر حال جانا ہے...... یہ ڈاک بنگلہ، یہ پہاڑ، جنگل یہ آبشار، یہ سب بہت خوبصورت ہیں۔ مگر...... مگر جس کام کے لئے میں جا رہا ہوں وہ اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے چوکیدار!

چوکیدار : آپ اس سے پہلے بھی کبھی اس طرف آئے ہیں حضور؟

وجے : (چائے پیتے ہوئے) نہیں پہلی بار آیا ہوں...... حالاں کہ مدت سے سوچ رہا تھا آنے کے لیے...... (لہجہ بدل کر) سارا انتظام تو مکمل ہے نا؟

چوکیدار : جی ہاں، سارا انتظام ہو چکا ہے۔ آپ کوئی گھنٹہ بھر میں روانہ ہو سکتے ہیں

وجے : (چائے ختم کر کے کھڑا ہو جاتا ہے) چوکیدار۔ تم تو اسی علاقے کے رہنے والے ہو...... کبھی مانجرول گئے ہو؟

چوکیدار : ہاں حضور۔ ایک بار گیا تھا..... ایک برات کے ساتھ

وجے : کیسی جگہ ہے؟ (میز پر سے سگریٹ کیس اٹھا کر ایک سگریٹ سلگاتا ہے)

چوکیدار : اب آپ جا ہی رہے ہیں، خود دیکھ لیجیے گا، چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ بڑی خوبصورت جگہ ہے...... ایک اونچے سے پہاڑ پر پیڑوں سے گھرا ہوا وہ گاؤں دور سے تو نظر بھی نہیں آتا!

وجے : (ٹہلتے ہوئے) اور وہاں کے لوگ؟

چوکیدار : یہ علاقہ شہر اور شہر کے رواجوں سے بہت دور ہے حضور...... یہاں کے لوگ سیدھے سادھے اور محنتی ہوتے ہیں...... مگر بہت غریب! غریبی ہی ان کی سب سے بڑی برائی ہے۔

وجے : غریبی کو برائی مت کہو چوکیدار۔ غریبی مجبوری ہوتی ہے۔

چوکیدار : ان لوگوں کو پیٹ بھر روٹی بھی ٹھیک سے نہیں ملتی۔ روپے کے لیے جان پر کھیل جاتے ہیں

آپ اس علاقے میں جتنے ہوشیار رہیں اچھا ہے۔

وجئے : تم فکر نہ کرو .... میرے پاس احتیاط کی ساری چیزیں موجود ہیں۔

چوکیدار : (رکتے ہوئے) برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں حضور؟

وجئے : پوچھو! کیا بات ہے؟

چوکیدار : ایسے دور دراز علاقے میں مانجر ول جیسے چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں آپ کو کون سا کام ہو سکتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آیا — !

وجئے : (مسکرا کر) ٹھیک ہے .... سمجھ میں آ بھی نہیں سکتا ...... (چونک کر) مگر ابھی نہیں ...... ابھی کچھ نہ پوچھو چوکیدار .... مجھے یہ کام کر لینے دو ...... بڑی مشکل سے یہ دن آیا ہے! اس کے لیے کتنے برسوں سے انتظار کیا ہے، کیا کیا خواب بسائے ہیں ذہن میں! .... میرے سوا یہ کوئی نہیں جانتا! ...... ابھی نہیں، شاید واپس ہوتے وقت میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔

چوکیدار : معاف کیجئے حضور ...... دراصل یہ بات مجھے پوچھنا بھی نہیں چاہیئے تھی! ...... اب آپ تیار ہو جائیے۔ وقت ہو رہا ہے۔

(چوکیدار چائے کے برتن ٹرے میں رکھتا جاتا ہے)

وجئے : (اپنے آپ سے) وقت ہو رہا ہے ...... میں تو تیار ہی ہوں ...... (جیسے چونک کر) کیوں چوکیدار، مانجرول شام تک پہنچ جاؤں گا نا؟

چوکیدار : جی ہاں۔ سانجھ سے پہلے آپ وہاں پہنچ جائیں گے، میں نے گھوڑوں کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ جو آدمی آپ کے ساتھ جائے گا وہ اس علاقے کے سارے راستے جانتا ہے۔

وجئے : بس ٹھیک ہے .... اب اور دیر نہیں کرنی چاہیئے۔

چوکید۔ : جی اچھا۔ میں چل کر آپ کے ناشتے کا انتظام کرتا ہوں اتنے میں وہ آدمی گھوڑے لے کر آ جائے گا۔

(چوکیدار ٹرے لے کر چلا جاتا ہے۔ وجئے گون اتارنے لگتا ہے پردہ آہستہ آہستہ گرجاتا ہے ———)

دوسرا منظر

(گاؤں میں ایک معمولی سے کچے مکان کا صحن۔ بائیں طرف دو بانسوں پر ٹھہرا ہوا چھپر جو صحن اور اسٹیج کے تقریباً ایک تہائی حصے کو گھیرے ہوئے ہے۔ دائیں طرف دیوار میں گھر کا باہر کا دروازہ ہے۔ دروازہ کے پاس دیوار سے لگی ایک پرانی کھاٹ کھڑی ہے۔ قریب ہی دو تین خالی ٹوکرے۔ کچھ گھاس پھوس اور مٹی کے برتن پڑے ہیں بیچ کی دیوار کے ساتھ مٹی کا ایک مٹکا، الونیم کا گلاس، لوہے کا ایک زنگ آلود ڈول، کچھ رسیوں کے ٹکڑے اور ایک گندا سا پڑا نظر آتا ہے، بائیں جانب چھپر سے طوطے کا ایک خالی پنجرہ لٹک رہا ہے۔ چھپر کے نیچے بان سے بُنا ہوا ایک پلنگ بغیر بستر کے پڑا ہے۔ پلنگ کے قریب دو ایک چوکیاں اور ایک کونے میں چکی رکھی ہے۔

پردہ اُٹھتا ہے تو چکی کے پاس زمین پر بیٹھی گوری چھاج میں دال پھٹک رہی ہے۔ گوری کے جسم پر سرخ کرتا اور میلے زرد رنگ کا لہنگا ہے۔ سرخ رنگ کی اُوڑھنی زمین پر پڑی ہے۔ دائیں دروازے سے وجئے اندر جھانکتا ہے۔ جس پر گوری چونک کر چھاج ایک طرف رکھ دیتی ہے۔ اُوڑھنی اُٹھا کر سر پہ رکھ لیتی ہے)۔

گوری : (غصے سے) کون ہو جی تم؟ .... یہاں کیا کر رہے ہو؟

وجئے : یہ مکان کس کا ہے؟

گوری : کیوں؟ ..... یہ میرے باپو کا گھر ہے۔

وجئے : تمہارے باپو کا نام؟

گوری : دینا، دینا باپو .... مگر تم کون ہو؟ ..... کیا کام ہے؟

وجئے : تمہارے باپو گھر پر ہیں؟

گوری : نہیں، ابھی چوپال تک گئے ہیں، آتے ہی ہوں گے (وجئے گھر کے اندر چلا آتا ہے۔ گوری غصے سے کھڑی ہو جاتی ہے۔) ارے! تم تو اندر چلے آئے!

گوری کی ماں : (اسٹیج کے باہر بائیں جانب سے آواز آتی ہے) کون ہے گوری؟ ..... کس سے باتیں کر رہی ہے؟

وجے : (گوری سے) یہ تمہاری ماں ہیں؟ کوئی بات نہیں، میں انہی سے بات کرلوں گا۔

گوری : (چیخ کر) ماں - یہاں تو آ ذرا .... دیکھ تو یہ کیسا آدمی ہے - آپ ہی آپ گھر کے اندر گھس آیا - کہتا ہے تجھ سے کچھ بات کرنی ہے!

ماں : کون ہے آخر! (بائیں جانب چھپر کے نیچے سے آتی ہے) اندر کیوں چلے آنے دیا تونے؟ ..... ارے یہ تو کوئی شہر کا بابو دکھائی دیتا ہے ...... اس کا یہاں کیا کام ہے؟

وجے : سنیئے ماں جی - مجھے یہاں اس گاؤں میں کچھ کام ہے - ابھی ابھی پہنچا ہوں - اندھیرا ہو گیا ہے - ٹھہرنے کا کوئی اور انتظام تو ہو گا نہیں، یہی سوچ کر تمہارے پاس چلا آیا ..... رات کاٹ کر صبح کہیں اور چلا جاؤں گا۔

ماں : کوئی اور گھر نہیں ملا تھا جو یہاں چلے آئے؟

وجے : نہیں ماں جی .... سب سے پہلے یہی گھر نظر آیا۔

گوری : نہیں نہیں ماں یہ نہیں ہو سکتا (وجے سے) تم یہاں نہیں ٹھہر سکتے - کوئی اور جگہ دیکھو۔

وجے : اب اس وقت کہاں جاؤں گا ...... یہیں پڑ رہنے دو۔

ماں : گوری ٹھیک کہتی ہے - تم یہاں نہیں ٹھہر سکتے ..... چوپال کیوں نہیں چلے جاتے؟

وجے : نہیں ماں جی - میں یہاں اجنبی ہوں - اتنی دور سے تھکا ہارا آ رہا ہوں ....

گوری : تو ہم کیا کریں؟ یہ کوئی سرائے سمجھ رکھی ہے؟

وجے : میں نے اسے سرائے تو نہیں کہا ہے۔

ماں : مگر ہمارے پاس جگہ بھی تو نہیں ہے - تمہیں ٹھہرائیں گے کہاں؟ ہم لوگ غریب آدمی ہیں - تم جیسے بابو کو یہاں آرام نہیں ملے گا۔

وجے : مجھے آرام کی ضرورت نہیں، کہیں بھی پڑ کر رات گذار لوں گا۔

گوری : نہیں ماں - اسے یہاں مت ٹھہرا ...... نہ معلوم کون ہے! اور پھر بابو بھی گھر پر نہیں ہے!

وجے : دیکھو، اگر چاہو تو میں اس کے لیے روپے دے سکتا ہوں۔

ماں : (آگے بڑھ کر) روپے! ...... کتنے روپے دے سکتے ہو؟

دبجئے : جتنے تم مانگو ...... مجبوری ہے۔

گوری : مجھے تو یہ آدمی کوئی بڑا بدمعاش لگتا ہے ماں۔

(دائیں دروازے سے دینا داخل ہوتا ہے، کوئی پچاس برس کا مضبوط گٹھے ہوئے جسم کا آدمی ہے۔ جسم پر میلی سی دھوتی، کھدر کا کرتہ اور ایک پرانی صدری ہے جو کئی جگہ سے پھٹ گئی ہے۔ منہ میں بیڑی ہے۔ بات کرتے ہوئے کھانستا اور تھوکتا جاتا ہے)

دینا : (آتے ہوئے) کون بدمعاش ہے گوری؟ .... کیا بات ہے؟

گوری : یہ آدمی رات کی رات یہاں ہمارے گھر ٹھہرنا چاہتا ہے بابو، میں نے کہا بھی کہ تم گھر پر نہیں ہو۔ مگر یہ اندر چلا آیا!

ماں : کہتا ہے اس کے لیے روپے دے گا ...... جتنے تم مانگو!

دینا : ہونہہ! ...... تمہارا نام کیا ہے!

دبجئے : دبجئے۔

دینا : (گھورتے ہوئے) شہر سے آئے ہو؟

دبجئے : ماں۔ اس گاؤں میں کچھ کام ہے۔ صبح چلا جاؤں گا۔

دینا : کتنے روپے ہیں تمہارے پاس۔

دبجئے : بہت سے۔ تمہیں کتنے چاہئیں؟

دینا : کہاں ہیں ...... بتا سکتے ہو؟

دبجئے : ہاں۔ یہ دیکھو۔ (سوٹ کیس پلنگ پر رکھ کر کھولتا ہے۔ اندر نوٹ بھرے پڑے ہیں) سارا سوٹ کیس بھرا پڑا ہے!

دینا اور ماں : (حیرت سے) اتنے سارے روپے!

دینا : یہ سب تم اکیلے ساتھ لیے پھر رہے ہو! .... قسمت والے ہو جو ابھی تک یہ تمہارے ساتھ ہی ہیں ...... اچھی بات ہے۔ رات کو تم یہاں ٹھہر سکتے ہو۔

گوری : مگر..... مگر بابو، یہ تو معلوم ہی نہیں .....

دینا : (بات کاٹ کر) تو چپ رہ گوری - جا اوپر چوبارا صاف کر دے - یہ وہیں ٹھہریں گے۔

(گوری چلی جاتی ہے)

ماں : تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا بھوکے ہی آ رہے ہو ؟

دجئے : کہاں ماں ! بھوکا ہی آ رہا ہوں ..... لو یہ روپے رکھ لو اور جو کچھ بھی ہو سکے اس وقت کھانے کا انتظام کروا دو !

(جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر دیتا ہے)

ماں : (حیرت سے) اتنے روپے !!

دینا : (جلدی سے) ٹھیک ہے۔ تم منہ ہاتھ دھو کر آرام کرو..... ابھی سب انتظام ہو جاتا ہے ..... (گوری کو پکارتا ہے) گوری - بابو کو چوبارہ تک پہنچا دینا -

(دینا، ماں سے روپے لے کر دائیں طرف سے باہر چلا جاتا ہے، ماں بائیں طرف چھپر کے اندر چلی جاتی ہے - دجئے کوٹ اور جوتے اتار کر پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے۔ بائیں طرف سے گوری آتی ہے)

گوری : چلو بابو صاحب ! اوپر اپنا کمرہ دیکھ لو ..... تمہارے جیسے بڑے آدمی کے لیے تو ذرا بھی نہیں بچتا - پر کیا کریں !

دجئے : تو میں بڑا آدمی ہوں ؟

گوری : اور کیا ! ——— نہیں تو تمہیں یہاں ٹھہرنے کون دیتا ؟

دجئے : تم لوگوں کے لیے روپیہ ہی سب سے بڑی چیز ہے ؟

گوری : ہم لوگ غریب ہیں، جنگلی ہیں ..... روپے کے لیے ایک دوسرے کی جان تک لے لیتے ہیں۔

دجئے : (اٹھ کر گوری کے قریب آتے ہوئے) دنیا میں ہمدردی اور محبت بھی تو کوئی چیز ہے گوری !

گوری : (پرے ہٹ کر) میں تمہیں چوبارے تک پہنچانے آئی تھی ..... یہ سب باتیں کرنے نہیں۔ ..... دیکھو، اس ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر سو بھی سکو گے ؟ اس سے اچھی اور کوئی کھاٹ نہیں ہمارے یہاں ...!

وجئے : نہیں، سب ٹھیک ہے، یہاں سو رہوں گا۔

گوری : تو اسے بھی اوپر لے جانا ہوگا۔ یہاں سردی سخت پڑتی ہے۔ تمہارے ساتھ گرم لحاف کھیس وغیرہ تو ہیں بھی نہیں! ...... اور پھر وہ چوبارہ ہمیشہ بند ہی رہتا ہے۔ گھر کا سارا کاٹھ کباڑ وہیں جمع رہتا ہے ...... فرش پر چڑیوں کی بیٹیں پڑی ہیں!.... ان سب چیزوں کی بدبو میں تمہیں نیند بھی آجائے گی بابو صاحب؟

وجئے : (مسکرا کر) تمہیں میرے لیے اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے! .... ابھی کچھ دیر پہلے تو تم مجھے یہاں ٹھہرانا بھی نہیں چاہتی تھیں!

گوری : ٹھہرانا تو میں اب بھی نہیں چاہتی ...... مگر تمہارے چمڑے کے صندوق میں اتنے سارے روپے جو بھرے پڑے ہیں!

وجئے : تو یہ بات ہے!

گوری : ہاں۔ بالکل یہی بات۔ بابو کو تم نہیں جانتے۔

وجئے : تمہارے بابو تم سے بہت محبت کرتے ہیں؟

گوری : انہیں کسی سے محبت نہیں۔ دن بھر کھیت پر لوگوں سے لڑتے رہتے ہیں۔ رات کو دارو پی پی کر ماں کو پیٹتے ہیں۔ انہیں روپے چاہئیں ..... دارو کے لیے، جوئے کے لیے۔ .... (جیسے چونک کر) مگر میں تمہیں یہ سب کیوں بتاؤں؟! ...... تم کیا کروگے یہ سب جان کر! لاؤ میں اس کھٹیا کی ادوائن کھینچ دوں ...... ڈھیلی پڑی ہے۔

(گوری زمین پر بیٹھ کر ادوائن کھینچنے لگتی ہے۔ وجئے پلنگ کی پیٹی پر بیٹھ جاتا ہے)۔

وجئے : تمہارے کوئی بھائی بہن نہیں ہے؟

گوری : ہے۔ بہن کا پچھلے سال بیاہ ہو گیا، دوسرے گاؤں میں۔ اور بھائی دس بارہ برس کا تھا ______ کہ ایک دن بابو کی مار سے ڈر کر گھر چھوڑ کر بھاگ گیا ... آج تک پتہ نہیں جیتا ہے یا مر گیا!

وجئے : او ...... تو گھر کا سارا کام تمہیں کو کرنا پڑتا ہے۔

گوری : کام نہ کریں تو کام کیسے چلے!

وجئے : مگر تم بہت کام کرتی ہو (کھسک کر قریب آجاتا ہے) شہر میں مرد بھی شاید اتنا کام نہیں کرتے۔

گوری : یہ تمہیں کیسے معلوم ؟

وجئے : ذرا اپنے ہاتھوں کو دیکھو ..... کیسے مضبوط اور سڈول ! ...... مگر اتنا کام کرنے سے کھردرے ہو گئے ہیں، ...... دیکھوں تو ذرا (جھک کر گوری کے ہاتھ پکڑنا چاہتا ہے)

گوری : (ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو جاتی ہے) اپنے ہاتھوں کو دور ہی رکھیے بابو صاحب .... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی !

وجئے : (کھڑے ہوتے ہوئے) مطلب یہ کہ اگر تم ان میلے کچیلے کپڑوں کی بجائے خوبصورت ساڑی اور بلاوز پہننے لگو، اس کھنڈر جیسے مکان کو چھوڑ کر صاف اور خوشنما بنگلے میں رہنے لگو، دن بھر محنت مشقت کرنے کی بجائے موٹر میں بیٹھ کر شہر کی سیر کیا کرو تو تمہاری زندگی کیسی سندر ہو جائے ! ..... تم کتنی خوبصورت لگنے لگو گی ! ...... تمہاری ایسی صحت، تمہارا سا جسم شہر میں کسی عورت کا نہیں ہوتا گوری !

گوری : (سخت غصے میں) بابو صاحب ...... تمہیں شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ؟ ..... کیا شہر میں مرد اجنبی عورتوں سے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں ؟!

وجئے : (ہنس کر) سب عورتوں سے نہیں !

گوری : مجھے کیسی عورت سمجھ رکھا ہے تم نے ؟ .... تم بہت بیوقوف دکھائی دیتے ہو۔

وجئے : تمہاری شادی ہو چکی ہے ؟

گوری : نہیں تو۔

وجئے : تب تو اور بھی ٹھیک ہے

گوری : کیا ٹھیک ہے ؟

وجئے : یہی .... تم میرے ساتھ شہر چل کر بڑی آسانی سے رہ سکو گی۔

گوری : (قریب آ کر) تمہارا سر تو نہیں پھر گیا ہے ؟

وجئے : (مسکرا کر) اس میں ہرج ہی کیا ہے ؟ .... تمہارے باپو اور ماں بھی تو ساتھ ہوں گے۔

گوری : تم اگر ہمارے مہمان نہ ہوتے تو اس گنڈاسے سے تمہاری گردن الگ کر دیتی (جھک کر گنڈاسا اٹھا لیتی ہے) تم کوئی بہت ہی بُرے آدمی معلوم ہوتے ہو!

وجیے : تم سمجھی نہیں گوری ..... میرے پاس ڈھیر سارا روپیہ جو ہے۔ سب تم ہی لوگوں کے لیے تو ہے! تمہارے باپو، ماں، سبھی سکھ آرام کی زندگی گذاریں گے۔ پھر میں تمہیں پڑھاؤں گا، لکھاؤں گا ..... شہر کی نمبر ایک لڑکی بنا دوں گا تمہیں .....!

گوری : اد وائن کھینچ چکی۔ اب چلتی ہوں۔ تم جیسے آدمی کے پاس کھڑے رہنے کو بھی جی نہیں چاہتا! .... آؤ میں تمہیں چوبارہ کا زینہ بتا دوں۔

وجیے : (سوٹ کیس اور کپڑے سنبھالتے ہوئے) نہیں گوری ..... میں اتنا بُرا نہیں ہوں۔

گوری : کپڑے بدل کر نیچے آجانا۔ یہیں گرم پانی مل جائے گا۔ منہ ہاتھ دھو لینا .... مگر یاد رکھو اگر پھر کوئی ایسی ویسی بات کی تو سب کے سامنے گدّی سے زبان کھینچ لوں گی .... سمجھے؟

وجیے : (جاتے ہوئے) سمجھا۔ مگر تمہیں جانے کی ایسی کیا جلدی ہے؟ .... مجھے ابھی کچھ اور باتیں ....

گوری : ماں چولھے پر اکیلی بیٹھی ہوگی۔ اس کا ہاتھ بٹانا ہے ..... (دونوں بائیں طرف جاتے ہیں) گوری زور سے کہتی ہے' چوبارے کا زینہ بہت ٹوٹ پھوٹ گیا ہے ..... دیکھ کر جانا!

(دونوں چلے جاتے ہیں۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)۔

تیسرا منظر

[وہی ہے جو دوسرے منظر میں تھا۔ البتہ چھپر کے نیچے بان کا پلنگ نہیں ہے۔ اس کی جگہ زمین پر چٹائی بچھی ہے۔ جس پہ کھانے کے چند برتن رکھے ہیں۔ چھپر کے ستون سے ایک سلگتی ہوئی لالٹین لٹک رہی ہے۔ ادھر ادھر ایک دو مُوڑھے اور ایک ٹین کی کرسی پڑی ہے۔

پر دیا اُٹھتا ہے۔ دجے (قمیص اور دھوتی میں) چٹائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا ہے
اس کے سامنے دینا اور ماں بیٹھے ہیں]۔

ماں : پتہ نہیں تمہیں اچھا لگا یا نہیں۔ شہر کا سا کھانا تو ہم یہاں پکا نہیں سکتے۔

دجے : نہیں ماں...... مجھے تو بہت اچھا لگا۔ پیٹ بھر کر کھایا ہے۔ (اُٹھ کر گلاس میں پانی لے کر ہاتھ دھوتا ہے)

دینا : (زور سے) گوری یہ برتن اٹھا لے، بابو صاحب کھانا کھا چکے۔

ماں : جب سونے لگو تو دودھ ضرور پی لینا۔ بادیے میں بھر کر الگ رکھ چھوڑا ہے۔

(گوری آکر برتن لے جاتی ہے۔ دجے، دینا اور ماں اٹھ کر مونڈھوں اور کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ماں سروتے سے چھالیا کاٹتی جاتی ہے)

دجے : آپ کو سچ مچ بہت تکلیف دی ہے میں نے.... اتنا سب انتظام کرنا پڑا۔

ماں : تکلیف کاہے کی بیٹا! ——— اور پھر سارا کام تو گوری نے کیا ہے۔

دجے : گوری نے کیا ہے! ——— تو گوری اتنا اچھا پکا لیتی ہے!.......
یہ لو ماں، میری طرف سے گوری کو انعام دیدینا۔

ماں : (دجے سے روپے لے کر) یہ کیا؟..... ایک دم اتنے روپے؟

گوری : (ڈیوڑی سے آتے ہوئے) نہیں، نہیں ماں، یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ روپے واپس کر دے۔

دجے : یہ تو رکھنے ہی پڑیں گے ماں جی، نہیں تو مجھے بہت دکھ ہوگا..... میں نے اپنی خوشی سے دیئے ہیں۔

دینا : گوری۔ جا تو اپنا کام کر........ چل یہاں سے (گوری واپس چلی جاتی ہے)
گوری کی ماں روپے رکھ لو........ بابو صاحب نے محبّت سے دیئے ہیں تو واپس نہیں کرنے چاہئیں۔

دجے : آپ مجھے بابو صاحب، بابو صاحب کیوں کہتے ہیں؟....... میرا نام دجے ہے میں تو آپ کے بیٹے سمان ہوں۔

ماں : (دُکھ بھرے لہجہ میں) وہ بھی........ وہ بھی اگر جیتا ہے تو تمہاری ہی

عمر کا ہوگا بیٹا۔

وجے : کون ...... کون ہوگا ماں جی ؟

دینا : کشن ...... کشن ہمارا بیٹا۔ چھوٹی سی عمر میں گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔

وجے : اوہ !

دینا : میں نے اُسے مارا تھا ...... بہت مارا تھا، اس نے میری دارو کی بوتل پھوڑ دی تھی۔ اس دن میں بہت نشے میں تھا۔

وجے : پھر اس کا کوئی پتہ نہیں چلا ؟

ماں : نہیں، آج تک کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا .... جانے جیتا بھی ہے یا مر گیا !

وجے : آپ لوگوں نے اُسے تلاش بھی نہیں کیا ؟

ماں : کیا تھا۔ آس پاس کے سارے گاؤں دیکھ ڈالے۔ کہیں پتہ نہیں چلا ....

دینا : اور پھر ہم لوگ چپ ہو گئے۔ ہمارے پاس اس کو کھلانے پلانے کے لیے روپے بھی تو نہیں تھے !

وجے : اوہ ! ..... معاف کیجئے۔ میں نے پرانی باتیں یاد دلا کر آپ کو دکھی کر دیا ہے۔

ماں : دکھ تو ہمارے بھاگ میں لکھا ہے بیٹا ...... چین نہ جب تھا نہ اب ہے۔

وجے : اب کونسا دکھ ہے ماں جی ؟

ماں : گوری سیانی ہو گئی ہے۔ اتنے دن ہو گئے ہیں۔ آج تک کہیں اس کے بیاہ کی بات پکی نہ کر سکے !

دینا : روپیہ ! ——— دنیا میں ہر جگہ روپے کی ضرورت پڑتی ہے وجے بابو بڑی لڑکی گنگا کے بیاہ میں قرض لینا پڑا تھا۔ وہی آج تک ادا نہ ہو سکا۔

وجے : اس گاؤں کے لوگ بڑے لالچی معلوم ہوتے ہیں۔

دینا : کون سا گاؤں ہے جہاں کے لوگ لالچی نہیں ہوتے ؟ جہاں روپے کے بغیر بیٹیوں کے بیاہ ہو جاتے ہیں ؟ .... مگر یہ بات وہ لوگ نہیں جان سکتے، جن کے ساتھ روپوؤں کے بھرے صندوق ہوتے ہیں ! ....

تبھی تو میں نے کہا تھا، تم بڑے نصیب والے ہو جو یہاں تک صحیح سلامت آپہنچے!

وجئے : مگر قانون بھی تو کوئی چیز ہے دینا بابو!

دینا : یہاں کا قانون اپنی اپنی قوت ہے وجئے بابو، اتنے دُور دراز مقام پر، جنگلوں اور پہاڑوں کو پھلانگ کر آپکا قانون نہیں پہنچنے پاتا!

وجئے : جتنا خوبصورت یہ گاؤں ہے، یہاں کے زمین آسمان ہیں، اتنے خوبصورت یہاں کے لوگوں کے دِل نہیں دکھائی دیتے۔

دینا : دل کسی کا خوبصورت نہیں ہوتا وجئے بابو، جو ایسا کہتے ہیں وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے تو زندگی میں ہمیشہ دھوکا جھوٹ اور برائیاں ہی دیکھی ہیں......

وجئے : ہوسکتا ہے کہ...... برائی آپ ہی میں ہو!

دینا : (غصّہ میں) نہیں! ——— مادھو سے میں نے کونسی برائی کی تھی؟ اس نے ہزار روپے مانگے تھے۔ گوری سے بیاہ کے عوض۔ میں نے دے بھی دیئے!.... مگر اب کہتا ہے ہزار اور لوں گا! بتاؤ وجئے بابو یہ دھوکا نہیں تو اور کیا ہے؟ ...... گوری جیسی لڑکی تو لاکھوں میں نہیں مل سکتی!

وجئے : پھر......... پھر اب کیا سوچا ہے؟

دینا : (اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے) میں نے سوچ لیا ہے یا تو وہ اسی ہزار روپؤں میں گوری سے بیاہ کرے گا..... یا پھر میں اس کا سر پتھر سے کچل دوں گا.... ہاں

وجئے : نہیں نہیں بابو۔ ایسا نہیں سوچتے، دنیا میں اچھے لوگ بھی بستے ہیں...... کہیں اور تلاش کرلو۔

دینا : (رک کر) کہاں تلاش کرلوں؟ کون ہے اچھا؟ .... مجھے تو ایک بھی نظر نہیں آتا۔

وجئے : گوری کی بات جانے دو۔ مگر یہ خیال کہ دنیا میں سب ہی بُرے ہیں، غلط ہے بابو

دینا : میں نہیں مانتا۔ (بیٹھ جاتا ہے)

وجئے : اچھا اگر میں وہ سارا روپیہ جو میرے ساتھ ہے تمہیں دیدوں تو تم مجھے کیا سمجھو گے؟

دینا : بے وقوف۔

وجے : اوہ .... کیا سب یہی سمجھیں گے ؟

دینا : میں اپنی بات کہہ رہا ہوں۔

ماں : وجے بیٹا .... اب تم جاکر سوجاؤ ...... دن بھر کے سفر سے تھک گئے ہوگے۔

وجے : تھک تو گیا ہوں ماں، نیند بھی آرہی ہے ...... (کھڑا ہوجاتا ہے) اب چلتا ہوں۔

دینا : وجے بابو .... روپے کا صندوق احتیاط سے رکھ کر سونا، یہاں کے لوگ اچھے نہیں ہیں۔

وجے : اوہ .... شکریہ (دینا اور ماں بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

ماں : ناشتہ کل صبح اوپر چوبارے پر ہی پہنچا دیا جائے گا۔

وجے : (اپنے آپ سے) کل صبح ! .... کل کی صبح کتنی عجیب ہوگی ! .... کتنی مختلف ! .... (جاتے جاتے رک جاتا ہے) ماں ....
ماں مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔

ماں : کیا بات ہے بیٹا ؟

وجے : (خیال بدل دیتا ہے) نہیں ...... کچھ نہیں ماں .... اب رہنے ہی دو ....
کل صبح کہوں گا ....

(وجے بائیں طرف چلا جاتا ہے۔ دینا اور ماں چند سیکنڈ خاموش کھڑے رہتے ہیں)

دینا : (آواز سے عزم کا اظہار ہوتا ہے) گوری کی ماں۔

ماں : کیا ہے ؟

دینا : (بیٹھتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے ہمارے دن پھر گئے۔ ایسا موقعہ پھر نہیں آئے گا۔

ماں : کیا کہہ رہے ہو ؟

دینا : کتنا روپیہ ہوگا اس کے پاس ؟

ماں : میں کیا جانوں ! .... پر ہے بہت سا !

دینا : بات بات پر روپیہ پانی کی طرح بہا دینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

ماں : (بیٹھتے ہوئے) پر تم کیا چاہتے ہو؟

دینا : اس کا روپیہ بھگوان نے خود اسے ہمارے گھر بھیجا ہے۔

ماں : ایسے کام میں بھگوان کا نام نہ لو۔

دینا : (اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) ٹھیک ہے۔ مجھے اب بھگوان کی نہیں، تمہاری اور گوری کی مدد کی ضرورت ہے'

ماں : مگر یہ سب اچھا نہیں ہے!

دینا : میں نے تمہاری رائے نہیں پوچھی تھی۔

ماں : (کھڑی ہو جاتی ہے) پر میرا دل گھبرا رہا ہے...... تم کیا سوچ رہے ہو۔ میں جانتی ہوں۔

دینا : گھبرانے کی بات ہی کیا ہے!...... کیا تم مجھے نہیں جانتیں؟........ اِن بازوؤں میں ابھی بہت طاقت ہے...... بہت!...... گوری کہاں ہے؟ (پکارتا ہے) گوری۔

گوری : (آتے ہوئے) کیا ہے باپو؟

دینا : وجے نے تجھ سے کیا باتیں کیں؟ (ٹہلنے لگتا ہے)

گوری : وہ اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا باپو۔

ماں : کیا کہا اس نے تجھ سے؟

گوری : کہنے لگا میرے ساتھ شہر چل کر رہنا...... تم بھی اور تمہارے باپو، تمہاری ماں بھی۔ خوب آرام سے ٹھاٹھ کرنا وہاں!

ماں : یہ سب کہا اس نے؟!

گوری : اور کہا، میرے سب روپے تم ہی لوگوں کے لیے تو ہیں!

دینا : بس، بس اب اور کچھ نہیں...... بے وقوف، بدمعاش کہیں کا! میں نے جو سوچا ہے وہی ہوگا۔ تم لوگ اب اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کی ترکیب سوچو۔

گوری : (سہم کر، پیچھے ہٹ جاتی ہے) باپو ـــــــ!

ماں : (گھبرا کر) مگر...... مگر کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو......؟

دینا : بے وقوف مت بنو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے پاس جتنا روپیہ ہے اس کی خبر بھی ہے تمہیں؟

گوری : یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اچھا نہیں ہے باپو!

دینا : (رُک کر) اچھا اور بُرا میں جانتا ہوں ۔ اور تم لوگ اتنے ڈر کیوں رہے ہو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
وہ تو شہر کا ایک کمزور سا چوہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چوہا! سمجھے؟ (ہنستا ہے) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
میرے خیال میں اس کی لاش پر سے پہاڑ سے نیچے لڑھکا دی جائے ۔ جنگل کے جانور
نشان بھی نہ چھوڑیں گے ۔

گوری : (سہمی ہوئی) لاش! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جنگل کے جانور! ۔ ۔ ۔ ۔ باپو تم لالچ میں اندھے ہو گئے ہو!

دینا : (غصے سے) خاموش! چپ رہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے نصیحتوں کی ضرورت نہیں ۔ میں نے
جو کہا ہے وہی ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ذرا باہر ہو آؤں ۔ کوئی گھنٹہ بھر میں لوٹوں گا
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم لوگ تیار رہنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سمجھے؟

ماں : مگر تم جا کہاں رہے ہو؟

دینا : (پلٹ کر) دارو پینے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اس کام کے لیے دارو کی سخت ضرورت ہے (ہنستا
ہوا جانے لگتا ہے ۔ دور سے کہتا ہے) گھنٹہ بھر بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سمجھیں؟

(دینا کے جاتے ہی پردہ گر جاتا ہے)

چوتھا منظر

(وہی ہے جو تیسرے منظر میں تھا، پردہ اُٹھتا ہے تو ماں ایک موڑھے پر بیٹھی نظر آتی ہے ۔ چہرے سے خوف اور پریشانی کے آثار نمایاں ہیں ۔ تھوڑی تھوڑی دیر سے بائیں طرف گھبرا کر دیکھنے لگتی ہے ۔ آخر کار چھپر کے ایک کونے میں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاتی ہے ۔ جیسے رو رہی ہو ۔ بائیں طرف سے دینا داخل ہوتا ہے ۔ قدم لڑکھڑا رہے ہیں ۔ چہرے اور آنکھوں سے غصہ اور دہشت جھلک رہی ہے ۔ ہاتھوں اور کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے ہیں اور سیدھے ہاتھ میں خون میں لتھڑا گنڈاسا ہے ۔ بات کرتے وقت زبان لڑکھڑا جاتی ہے) ۔

دینا : بے وقوف ! .... کمزور کہیں کا ! اتنی جلدی مرگیا ! ..... مرغی جرجاگنڈاسا
ایک طرف پھینک دیتا ہے)
ماں : (ماں آگے آتے ہوئے) کیا..... کیا ختم ہوگیا ؟ ..... ہائے ! (رو پڑتی ہے۔)
دینا : (غصے میں) رو مت .... تمہارے رونے سے میری ہمت کم ہونے لگتی ہے۔
ماں : تم .... تم کتنے خوفناک لگ رہے ہو ! ...... بے رحم جلاد کی طرح !
دینا : (چیخ کر) چپ رہو ! میں کہتا ہوں چپ رہو۔
ماں : اپنے ہاتھوں سے خون کے دھبے پونچھ ڈالو........ لو یہ کپڑا (زمین پر سے ایک
چیتھڑا اٹھا کر دیتی ہے)
دینا : (خوفناک قہقہہ لگا کر) خون کے دھبے ! ...... ایک بیوقوف، بوڑھے آدمی
کے خون کے دھبے ! ......
(دھبے صاف کرتے ہوئے) گوری کہاں ہے ؟
ماں : یہیں کہیں ہوگی .... ابھی تو یہیں بیٹھی تھی .... شاید وہ تمہارے
سامنے نہیں آنا چاہتی۔
دینا : (برہم ہوکر) کیوں نہیں چاہتی ؟ اُسے آنا پڑے گا...... اسے اٹھا کر نیچے کیا
میں اکیلا لاؤں گا ؟
ماں : (گھبرا کر) نہیں نہیں - ابھی ٹھہر جاؤ۔ پہلے ..... پہلے دیکھ تو لو اچھی طرح۔
سب کچھ ختم ہوگیا یا نہیں !
دینا : ہو چکا - میرے ہاتھ کا ایک ہی وار کافی ہوتا ہے ..... سمجھیں ؟ جاؤ (بائیں طرف
دیکھتے ہوئے) وہ دیکھو زینے کے نیچے اس کا صندوق دھرا ہے۔ یہاں لے آؤ (ماں
گھبرائی ہوئی سی جاتی ہے) گدھا کہیں کا ! .... گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا !
جیسے اس کے باپ کا گھر ہو ! (زور سے ہنستا ہے)
ماں : (سوٹ کیس لاکر دینا کو دیتے ہوئے) تم نے آج بہت شراب پی رکھی ہے !
دینا : ہاں .... آج کی رات پھر نہیں آئے گی (ہنستے ہوئے سوٹ کیس کو کرسی

پر رکھ کر کھولنا شروع کر دیتا ہے) گوری کی ماں ..... ذرا لالٹین کی بتی اونچی کرو....
کہتا تھا، سارے روپے تم ہی لوگوں کے لیے تو ہیں! (قہقہہ) دائیں دروازے پر
کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے۔ دینا چونک کر سوٹ کیس کھولتے کھولتے بند کر دیتا ہے۔
ماں ڈر کر اس کے قریب کھسک آتی ہے۔)

ماں : (آہستہ سے) کون ہے! کون آیا ہے اس وقت؟

دینا : (غصے سے) کون آیا ہے اتنی رات کو؟ ..... گوری (چیخ کر) گوری۔ ذرا دیکھ تو
کون آیا ہے! .... میرا گنڈاسا کہاں ہے۔
(جھک کر زمین سے گنڈاسا اٹھا لیتا ہے)

ماں : (دینا سے گنڈاسا چھین کر) نہیں، نہیں ..... اسے رہنے دو۔ جانے کیا بات ہے!
...... میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ جاؤ۔ تم اندر چلے جاؤ .... یہ کپڑے
اتار ڈالو ..... جاؤ، دردنے لگتی ہے۔)

(باہر پھر دستک ہوتی ہے۔ دینا بائیں طرف اندر چلا جاتا ہے، اسی
طرف سے گوری گھبرائی سی آ کر دائیں طرف کا دروازہ کھولتی ہے، ماں سہمی
ہوئی دیکھ رہی ہے)

گوری : (دروازہ پر سے) باپو .... پیپل والا جیتو آیا ہے .... جیتو کاکا۔

دِینا : (بائیں جانب اندر سے) پیپل والا جیتو! ..... اچھا ...... اچھا ....
اچھا ٹھہرو۔ میں آ رہا ہوں۔

(گوری اور ماں بائیں طرف چلی جاتی ہیں۔ جیتو اندر آ جاتا ہے۔ شراب
میں بدمست ہے، دھوتی اور کرتے پر ایک میلا سا کالا کوٹ پہنے ہوئے
ہے، ہاتھ میں شراب کی بوتل ہے، قدم ٹیڑھے پڑ رہے ہیں۔ زبان
لڑکھڑا جاتی ہے)

جیتو : ارے بھئی کہاں ہو دینا .... !

دِینا : (بائیں طرف سے آتا ہے۔ جسم پر ایک پرانی چادر لپیٹے ہوئے ہے) کون جیتو؟ !...

.... ارے کیسے آیا اس وقت ؟

جیتو : اڈے پر گیا تھا ..... معلوم ہوا تم ابھی ابھی پی کر گئے ہو ..... سوچا ابھی جاگ رہے ہوگے - مل کر بدھائی دے آؤں .....'

دینا : بدھائی ——— کیسی بدھائی ؟

جیتو : (ہنستے ہوئے) ہم سے بھی چھپا رہے ہے دینا ! ہمیں سب معلوم ہے ، آج تم اتنی بہت سی کیوں پی گئے ہو -

دینا : کیا بکتا ہے ؟ .... صاف صاف کیوں نہیں کہتا کیا بات ہے ؟

جیتو : ارے کیا مجھی کو بتانا پڑے گا ؟ .... اٹھارہ برس بعد بیٹا گھر آیا ہے اور باپ مجھی سے پوچھتا ہے کیا بات ہے !

دینا : (چیخ کر) جیتو ! ——— کس کا بیٹا ؟

جیتو : (سنبھل کر) تمہارا ، اور کس کا ! کشن نے آتے وقت تمہارے گھر کا پتہ مجھ ہی سے تو پوچھا تھا ! .... ارے اب تو وہ پورا لاٹ صاحب لگتا ہے !

دینا : (گھبرا کر ایک موڑھے پر بیٹھ جاتا ہے) نہیں .... وہ ..... وہ تو دھیئے ہے !

جیتو : دھیئے ! (ہنستا ہے) .... کیا کشن کو پہچان نہ سکے دینا ؟ ..... ٹھیک ہے، کہتا تھا آج کسی کو کچھ بھی نہ بتاؤں گا - کہ میں کون ہوں ......؟

دینا : اور .... اور کیا کہا اس نے ؟

جیتو : کل .... شاید کل صبح بتانے کو کہتا تھا اور ..... اور دینا وہ تو تمہیں شہر لے جانے کو آیا ہے ..... تم سب کو ! وہاں اس کا بہت بڑا بنگلہ ہے، موٹر ہے .... اور .....

دینا : (تڑپ کر کھڑا ہو جاتا ہے) نہیں ..... نہیں - یہ سب جھوٹ ہے (زور سے رونے لگتا ہے)

جیتو : کیا کہتے ہو ؟ ...... بات کیا ہے دینا ! ...... دینا ؟

دینا : (روتے ہوئے بے چیخ کر) گوری کی ماں ..... سنا تم نے ؟ وہ ..... وہ ہمارا کشن ہے ! .... ہمارا کشن ! ....'

(دینا روتے ہوئے کرسی اور سوٹ کیس پر گر پڑتا ہے - جیتو لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی طرف بڑھتا جاتا ہے .... ساتھ ہی پردہ گر جاتا ہے)

زندگی کے کنارے

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

کردار :۔

پروفیسر : عمر تقریباً پچاس برس ۔ باوقار شخصیت

نوجوان : عمر تقریباً چھبیس برس ۔ اونچا قد ۔ سر کے بال لمبے ۔

رام داس : ریسرچ اسکالر، جو پروفیسر کے تحت کام کر رہا ہے ۔

لڑکی : دلکش خد و خال ۔ روشن اور بڑی بڑی آنکھیں ۔
عمر تقریباً چوبیس برس ۔

کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ پائپ اٹھا کر سلگاتا ہے .... پھر ٹہلنے لگتا ہے۔
رام داس درمیانی تپائی پر آہستہ آہستہ چائے بناتا رہتا ہے، اور باتیں بھی
کرتا جاتا ہے ______]

پروفیسر : تم نے ڈاکٹر گھوش کی یہ نئی کتاب نہیں پڑھی،

MYSTERIES OF HUMAN MIND ؟

رام داس : جی نہیں۔

پروفیسر : جب پڑھو تو اس کا تیسرا CHAPTER بہت غور سے پڑھنا۔ اسمیں کئی کام کی باتیں ہیں ...... (ٹہلتا ہوا دریچہ کے پاس جاکر رکجاتا ہے) ...... آج سردی بڑھ گئی ہے۔

رام داس : جی ہاں۔ ہوا بہت سرد ہے ...... کہئے تو کھڑکی بند کر دوں ؟

پروفیسر : (کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے) : نہیں۔ اسے کھلا رہنے دو ...... یہاں سے میں اس پل اور پل کے نیچے بہنے والے دریا کو آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔ ناریل کے درختوں کے پیچھے سے چاند بھی نکل آیا ہے۔ اس کا زرد چہرہ پانی کی سطح پر جھولتا ہوا عجیب سا لگ رہا ہے ..... (رک کر) آج پل پر بڑا سناٹا ہے۔ ایک آدمی بھی چلتا نظر نہیں آتا !

رام داس : جی ہاں۔ ہر طرف موت کی خاموشی چھائی ہوئی ہے ______

پروفیسر : (پلٹ کر مسکراتے ہوئے) : موت کی خاموشی ______ تم موت سے ڈرتے ہو رام داس ؟

رام داس : موت سے کون نہیں ڈرتا پروفیسر صاحب ______ ؟

پروفیسر : ٹھیک۔ موت سے سب ڈرتے ہیں۔ ہماری ساری زندگی پر آنے والی موت کا اَن دیکھا، اجنبی سایہ تیرتا رہتا ہے، اور ہم ...... اس کی اٹل حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اسے بھلا دینا چاہتے ہیں ...... ہم یہ مانتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کہ ہم موت سے ڈرتے ہیں ______

رام داس : زندگی اور موت، موت اور زندگی ...... ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہیں۔

پروفیسر : نہیں رام داس ۔ موت اور زندگی دو مختلف حقیقتیں ہیں۔

رام داس : (چائے کی پیالی لاکر پروفیسر کو دیتا ہے) : زندگی دے کر قدرت نے ہم سب پر احسان کیا ہے ۔

پروفیسر : (پیالی ہاتھ میں لئے) : لیکن موت قدرت کا شاہکار ہے ۔ موت کے بغیر زندگی کتنی غیر اہم کتنی ادھوری اور بے معنی ہو جاتی، کبھی سوچا ہے تم نے ؟ (پیالی میز پر رکھکر ٹہلنے لگتا ہے) ــــــ اور پھر ...... ایسے کتنے ہی لوگ ہیں جو زندگی کی دولت پاکر بھی موت کی خواہش کرتے ہیں، ...... جو اس آباد، بارونق دنیا میں رہتے ہوئے بھی تنہا ہیں ــــــ ! (واپس آکر چائے پیتا ہے) ــــــ رام داس ۔ کیا اس لڑکی نے چائے پی ؟

رام داس : (چائے پیتے ہوئے) : جی ہاں ۔ صرف چائے پی، ۔ کچھ کھایا پیا نہیں۔

پروفیسر : ہوں ...... ٹھیک ہے ۔ اس کی موجودہ دماغی حالت کا یہی تقاضا ہے .....

[چائے کی خالی پیالی میز پر رکھکر، دریچے کے سامنے جاکھڑا ہوتا ہے]

رام داس : وہ بڑی بے چین ہے .... کہتی ہے آپ کی بات مان کر اس نے بڑی غلطی کی ۔

پروفیسر : تم اس کی باتوں کی فکر مت کرو .... غلط اور صحیح کی پہچان وہ بھلا کیا کرسکتی ہے ! .... کون ہے جو یہ کہہ سکتا ہے وہ کب اور کونسی غلطی کر رہا ہے ! ...... (رک کر ..... آہستہ سے) رام داس ــــــ !

[رام داس اس کے قریب آجاتا ہے ۔ پروفیسر اسے دریچے میں سے باہر دیکھنے کا اشارہ کرتا ہے، رام داس چپ چاپ دیکھنے لگتا ہے]

ــــــ دیکھ رہے ہو ؟ ...... کچھ دیر سے وہ وہیں پل پر کھڑا نیچے دیکھ رہا ہے .....

[پروفیسر اور رام داس پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں ۔ پھر باہر دیکھنے لگتے ہیں]

رام داس : (گردن ہلاکر) : آپ کا اندازہ صحیح معلوم ہوتا ہے .....

پروفیسر : کیا تمہیں اسکا چہرہ نظر آرہا ہے ؟

رام داس : جی نہیں ..... مگر وہ بہت بے چین DESPERATE سا لگتا ہے ......

پروفیسر : (چونک کر) : رام داس ـــــ ! جلدی کرو ...... وہ پل کی ریلنگ پر
چڑھ رہا ہے ...... دوڑو .... دوڑو رام داس ..... [رام داس
تیزی سے بائیں دروازے سے باہر نکل جاتا ہے ۔ پروفیسر چیخ کر کہتا رہتا ہے]
.... دیکھو ، ذرا ہوشیاری سے .... اسے معلوم نہ ہو تم آ رہے ہو
...... ٹھیرو ، میں بھی آتا ہوں ..... (اضطراب آمیز موسیقی کے سُر اُبھرتے ہیں)
[رام داس کے پیچھے چلا جاتا ہے ۔ اسٹیج پر چند لمحے مدھم روشنی ۔ جھٹکے بعد رام داس
بائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے ۔ ادھر ادھر دیکھتا ہے ، دریچے میں سے
باہر جھانکتا ہے ۔ پھر میز پر سے چائے کی پیالیاں اٹھا کر دائیں دروازے
سے چلا جاتا ہے ـــــ اسٹیج کے باہر سے آوازیں ابھرتی ہیں]
نوجوان کی آواز : (بدحواسی میں) : ـــــ تم مجھے کہاں لئے جا رہے ہو ؟ ..... میں کہتا ہوں ،
مجھے چھوڑ دو ...... واپس جانے دو مجھے ....
پروفیسر کی آواز : چلے جانا بھائی .... ابھی چلے جانا .... یہ رہا میرا گھر ....
بس ذرا میرے ساتھ تو آؤ ....
نوجوان کی آواز : (غصے میں) : کیوں آؤں ؟ .... تم کیا چاہتے ہو ؟ .... میں
نہیں آؤنگا تمہارے ساتھ ۔
[پروفیسر نوجوان کیساتھ بائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے ۔
نوجوان پریشان سا اِدھر اُدھر دیکھتا ہے ، پروفیسر جیسے
زبردستی اسے آگے بڑھاتا ہے]
نوجوان : یہ سب کیا ہے ؟ ـــــ مجھے یہاں کیوں لے آئے ؟ .... تم آخر کون ہو ؟
.... اور ..... اور وہ کون تھا جس نے مجھے زبردستی اپنے ہاتھوں میں
جکڑ لیا ـــــــ ؟
پروفیسر : (مسکرا کر) : وہ ...... وہ رام داس ہے ۔ میرا ایک شاگرد ۔
نوجوان : ہوگا ۔ اب مجھے جانے دو ۔

پروفیسر : بے وقوف نہ بنو نوجوان ——— (قریب آکر) کہاں جانا چاہتے ہو؟

نوجوان : تمہیں اس سے کیا؟

پروفیسر : (دریچے کے پاس لے جاکر) : دیکھو۔ باہر کسی بھیانک رات ہے! ..... اور وہ پُل ..... کتنا اونچا ہے وہ پُل! .... دریا بھی چڑھاؤ پر ہے۔

نوجوان : میں سب دیکھ رہا ہوں .... مجھے سب معلوم ہے۔ میں .... مجھے ایسی ہی رات، ایسی ہی جگہ چاہیئے (بے چینی سے ٹہلنے لگتا ہے) تم نہیں جانتے، یہہ وقت میرے لئے بہت اہم ہے .... بہت! یہہ کہیں گذر نہ جائے۔ مجھے جانے دو، .... میں کہتا ہوں آخر ....

پروفیسر : (نوجوان کو صوفے پر بٹھاتے ہوئے) : اچھی بات ہے۔ چلے جانا۔ میری ایک بات .... بس ایک بات سن لو ..... یہاں بیٹھ جاؤ آرام سے۔

نوجوان : (اٹھکر کھڑا ہو جاتا ہے) : آرام؟ ..... کیا تم مجھے آرام دے سکتے ہو؟ ..... کیا تم مجھے سکون بخش سکتے ہو؟ ——— (اضطراری ہنسی۔ ٹہلنے لگتا ہے) نہیں۔ تم مجھے یہہ سب نہیں دے سکتے ...... کوئی نہیں ....

پروفیسر : تو پھر تم اسے کہاں تلاش کرنے نکلے تھے؟

نوجوان : (پلٹ کر) : اس پل کے نیچے .... دریا کی سرد لہروں میں۔

پروفیسر : (زور سے) : تم مرنا چاہتے ہو؟

نوجوان : (چیخ کر) : ہاں۔ میں مرنا چاہتا ہوں .... اور یہہ تم جانتے ہو .... (قریب آکر) کیا تم مجھے مرنے سے روک سکتے ہو؟

پروفیسر : ہرگز نہیں۔ میں تو تم سے دو ایک باتیں کرنا چاہتا ہوں ..... آؤ۔ یہاں بیٹھ جاؤ (نوجوان کو دوبارہ صوفے پر بٹھاتا ہے) جو آدمی مرنا چاہے اُسے کون روک سکتا ہے۔

نوجوان : پھر تم میرے پیچھے کیوں پڑے ہو؟ مجھے جانے دو ..... مجھے دیر ہو رہی ہے۔

پروفیسر : (دائیں طرف کی میز کے پاس جاکر، کچھ کاغذ الٹ پلٹ کرتے ہوئے) : کیا

تمہیں موت اتنی پیاری لگ رہی ہے ؟

نوجوان : (جیسے اپنے آپ سے) : موت ! ...... موت سے پیاری بھی کوئی چیز ہے کیسی حسین ...... کتنی دلکش ! تم نہیں جانتے میں نے کتنے جتن، کتنے ارمانو سے اسے منایا ہے۔ اور جب میں اس سے ملنے جارہا ہوں ...... جب وہ مجھے بلا رہی ہے ...... اپنے پاس بلا رہی ہے ...... تو تم ...... تو تم بیچ میں آ دھمکے ! (بہو بدل کر)
_____ لیکن تم کیا جانو ان باتوں کو ! .... جاؤ اپنا کام کرو۔

پروفیسر : میں اپنا کام ہی تو کر رہا ہوں۔

نوجوان : کیا مطلب _____ ؟

پروفیسر : (قریب بیٹھکر) : مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔

نوجوان : (تعجب سے) : _____ میری مدد !

پروفیسر : ہاں ۔ تمہاری مدد

نوجوان : مگر میں ایک بے مصرف آدمی ! ...... دنیا اور دنیا والوں پر ایک بوجھ ...
مجھ جیسا بیکار آدمی بھلا کسی کی کیا مدد کر سکتا ہے !

[آخری الفاظ ختم ہونے سے پہلے، رام داس ہاتھ میں کافی کی پیالی لیکر آجاتا ہے]

رام داس : (نوجوان کے قریب آکر) : دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں بنائی گئی ......

پروفیسر : تمہارا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ قدرت کو تمہاری ضرورت تھی۔

رام داس : لو یہ کافی پی لو۔

نوجوان : مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

رام داس : تمہیں اس کی ضرورت ہے۔ پی لو۔

نوجوان : (قدرے تامل کے بعد لیتا ہے۔ ایک گھونٹ پی کر) : میں آخر ......
تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں ؟

پروفیسر : میرا ایک کام ہے، اور ...... اور تم ہی کر سکتے ہو۔

نوجوان : (دو ایک گھونٹ میں پیالی خالی کر کے) : کیا کسی کے یہاں چوری کرانی ہے ؟

پروفیسر : تم یہہ کام نہیں کر سکتے۔

نوجوان : کیا کسی کو قتل کرانا چاہتے ہو ؟

پروفیسر : نہیں۔ یہہ سارے کام تم نہیں کر سکتے۔

نوجوان : کیوں۔ بھلا میں کیوں نہیں کر سکتا ؟

پروفیسر : اسلئے کہ چوری کرنا برائی ہے، اور تم ایک نیک آدمی ہو...... قتل کرنا بزدلی ہے
...... اور تم ایک بہادر آدمی ہو۔

نوجوان : اور...... تمہیں کیسے پتہ چلا، میں بہادر ہوں ؟

پروفیسر : اس اونچائی پر سے چھلانگ لگا کر، اپنی جان کو سرد لہروں کے حوالے کر دینا،.....
کیا بہادری کا ثبوت نہیں ہے ؟

نوجوان : مگر...... مگر لوگ کہتے ہیں، خودکشی بزدلی کا کام ہے۔

رام داس : [جو اس دوران میں پیچھے دیوار کیساتھ کھڑا رہتا ہے، آگے آتا ہے] : خودکشی کے لیے
بے حساب ہمت کی ضرورت ہوتی ہے بابو صاحب۔

نوجوان : [پلٹ کر، قریب جاتا ہے] تم نے مجھے چھلانگ لگانے سے روک دیا۔ تم نے مجھے..
...... اوہ وہ ساری ہمت کیا میں پھر جمع کر سکوں گا ! ـــــــ اب بھی وقت ہے
...... مجھے جانے کیوں نہیں دیتے......
(پروفیسر کے قریب جاکر) ...... آخر تم کہتے کیوں نہیں کیا کام ہے تمہارا مجھ سے !

پروفیسر : (پائپ سلگاتے ہوئے) : میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔

نوجوان : تو میں کیا کروں۔

[رام داس خالی پیالی لیکر چلا جاتا ہے۔ پروفیسر چند لمحے دیوار کے
پاس جاکر تصویر کو دیکھتا رہتا ہے]

پروفیسر : بات یہہ ہے نوجوان...... میں نفسیات کا پروفیسر ہوں۔ ایک کتاب لکھ رہا ہوں
...... اسمیں ایک مسئلہ آن پڑا ہے ...... سگریٹ پیو گے ؟ [میز پہ

سے سگریٹ کیس اٹھا کر بڑھاتا ہے]

نوجوان : جی نہیں ۔ [پروفیسر سگریٹ کیس اسی طرح بڑھائے رکھتا ہے، نوجوان ذرا سے توقف کے بعد ایک سگریٹ لے لیتا ہے]

پروفیسر : تو مسئلہ یہ آپڑا ہے کہ خودکشی کے وقت آدمی کے دماغ کی کیا کیفیت ہوتی ہے ۔ اور... اس کے خیالات، احساسات کیسے ہوتے ہیں !

نوجوان : اسمیں کونسی مشکل ہے ...... کیا آدمی کا دماغ بدل جاتا ہے ؟ ـــــ میرے خیالات میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔

پروفیسر : (لائٹر سے نوجوان کی سگریٹ سلگاتا ہے) : یہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں ۔

نوجوان : (لمبا کش لیکر) : تو بس یہی پوچھنا تھا آپ کو پروفیسر صاحب ؟ ـــــ اب مجھے جانے دیجئے ۔

پروفیسر : چلے جانا بھائی ...... چلے جانا ۔ مگر ابھی نہیں ...... ایک گھنٹے کے بعد میں تمہیں وہیں پل پر چھوڑ آؤنگا .... بلکہ تمہارے پیٹ سے دو چار پتھر باندھ دونگا، تاکہ تمہیں ڈوبنے میں آسانی ہو ۔

نوجوان : خوب ۔ آپ میری موت سے کھیلنا چاہتے ہیں ...... (جاکر دریچے میں سے باہر دیکھتا ہے) ـــــ میں مر رہا ہوں اور ..... اور آپ کو اپنی کتاب کی پڑی ہوئی ہے ۔

پروفیسر : (قریب آکر) : میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ تم مل گئے ۔

نوجوان : آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں ۔ کیا میں دیوانہ ہوں ...... پاگل ہوں ؟

پروفیسر : نہیں ۔ یہ بات نہیں ۔ اگر تم مجھے نہ ملتے تو میری کئی دن کی محنت برباد ہوجاتی ...
.... آؤ یہاں بیٹھ جاؤ [نوجوان کو صوفے پر بٹھا کر، خود بھی قریب بیٹھ جاتا ہے]
..... تین دن ہوئے، میری ملاقات ایک لڑکی سے ہوگئی ...... وہ بھی خودکشی کرنے والی تھی ..... مگر اتفاق سے میں عین وقت پر پہنچ گیا ۔

نوجوان : تو کیا وہ لڑکی .... ابھی زندہ ہے ۔

رفیسر : ہاں ۔

جوان : ـــــــ عورت جو ہوئی ۔ اس نے شائد اپنا ارادہ بدل دیا ہوگا ۔

رفیسر : نہیں ۔ یہی تو مشکل ہے ۔ وہ اپنے ارادے پر چٹان کی طرح قائم ہے ۔ میں نے بہت سمجھایا ، بہت کوشش کی ، مگر نہیں مانی ۔ آج اسکی زندگی کا آخری دن ہے ..... یا یوں کہو کہ آخری رات ہے ...... ابھی کچھ دیر بعد وہ مرجائے گی ۔

جوان : آپ نے اسے سمجھانے کی پوری کوشش نہیں کی .... ورنہ ایک لڑکی کو سمجھانا ہی کیا !

رفیسر : خوب ! ـــــ تو تمہارا مطلب ہے ، لڑکیاں آسانی سے مان جاتی ہیں ؟

جوان : یقیناً

رفیسر : نہیں ینگ مین ...... ان کی ہٹ تو مشہور ہے

جوان : ہوگی ۔ میں نہیں مانتا ۔

رفیسر : میرے دوست ۔ میں یہہ کام پندرہ برس سے کر رہا ہوں ۔ مجھے اسمیں بہت تجربہ ہے ۔

جوان : تو کیا آپ کو اور بھی ایسے لوگ ملے جو مرنا چاہتے تھے ۔

رفیسر : ہاں ، ہاں ۔ کیوں نہیں ۔ میں مختلف جگہوں پر ، مختلف حالات میں ایسے کئی لوگوں سے ملا ہوں ۔

جوان : مرنے والوں میں مرد ہی زیادہ ہوں گے ۔

رفیسر : نہیں ۔ ایسی کوئی بات نہیں ۔ مردوں اور عورتوں کے لحاظ سے میں نے مختلف اعداد و شمار جمع کئے ہیں ۔ ان سے بڑے دلچسپ نتیجے نکلے ہیں ...... کیا تم سننا چاہوگے ؟

جوان : (جیسے چونک کر) : جی نہیں ۔ مجھے نہیں چاہیئے ...... مجھے کچھ سننا نہیں ہے ..... [اٹھکر دریچے کے قریب چلا جاتا ہے] آپ نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ۔ میں اب تک دریا کی پرسکون لہروں میں آرام سے سو گیا ہوتا ۔

رفیسر : میں نے وعدہ کیا ہے ایک گھنٹے بعد تم کو وہیں چھوڑ آؤنگا ...... میں اپنی کتاب تم ہی لوگوں کے نام منسوب کرونگا ۔ اور دیباچے میں خاص طور پر تمہارا شکریہ ادا کرونگا ...... کیا نام ہے تمہارا ؟

نوجوان : (پلٹ کر پروفیسر کو دیکھتا ہے) : میرا نام ؟ ..... چھوڑ یئے بھی میرے نام کو۔

پروفیسر : ـــــــ آخر نام بتانے میں کیا ہرج ہے ؟

نوجوان : میرانام ..... (آکر صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)۔ ایک بدنصیب۔

پروفیسر : ٹھیک ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔

نوجوان : ـــــــ جی ؟!

پروفیسر : اس نام کے لوگ بڑے بہادر ہوتے ہیں۔

نوجوان : ہوں گے ..... لیکن ابھی آپ کو اور کیا کہنا ہے ؟

پروفیسر : کیا کام کرتے ہو؟

نوجوان : کچھ نہیں۔

پروفیسر : کچھ تو کرتے ہوگے۔

نوجوان : شاعری کرتا ہوں۔

پروفیسر : او، تو تم شاعر ہو

نوجوان : جی ہاں۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے ! ..... اب مجھ سے کچھ اور نہیں پوچھئے ..... میں کچھ نہیں بتاؤنگا ـــــــ

پروفیسر : (اٹھکر ٹہلنے لگتا ہے) :۔ آج ٹھیک ایک بجے وہ لڑکی خودکشی کرلے گی۔

نوجوان : مگر میں ابتک نہیں سمجھا، ..... آخر اسکا مجھ سے کیا تعلق ہے ؟

پروفیسر : [رک کر، دیوار کے سہارے رکھے ہوئے مجسمے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے] :۔ تم بھی مرنے والے ہو، اور ..... اور وہ لڑکی بھی مرنے والی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے تم دونوں کی ملاقات کراؤں، ..... اور ..... دونوں کی ذہنی کیفیت کا مطالعہ کروں۔

نوجوان : لیکن ..... ایک مرنے والا، دوسرے مرنے والے سے کیا بات کرے گا ...!

پروفیسر : (پلٹ کر) : تم نہیں جانتے۔ اس سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوں گی ..... قیمتی SUGGESTIONS ملینگے۔ شائد ..... میں کسی مفید نتیجے پر پہنچ سکوں ..... (پھر ٹہلنے لگتا ہے) ..... دو بدنصیب شباب، جو

زندگیوں سے کھیلنا چاہتے ہیں! ..... ایسے موقعے بار بار نہیں آتے!

نوجوان : ـــــــــ کیا عمر ہے اس لڑکی کی؟

پروفیسر : یہی کوئی بائیس یا تیئیس برس ...... [آکر نوجوان کے قریب بیٹھ جاتا ہے]

نوجوان : اس کی شادی ہو چکی ہے؟

پروفیسر : بڑی ضدی ہے وہ لڑکی .... کچھ نہیں بتاتی۔

نوجوان : مگر وہ خودکشی کیوں کرنا چاہتی ہے؟

پروفیسر : کہہ تو دیا، بڑی بدمزاج ہے ..... تین دن سے میرے یہاں ہے، مگر یہہ نہیں بتایا کون ہے، کیا نام ہے۔ کہاں رہتی ہے .... کیوں مرنا چاہتی ہے۔

نوجوان : شائد کسی کی محبت کے جھوٹے وعدوں کا شکار ہوئی ہو!

پروفیسر : ہو سکتا ہے۔ یا پھر شائد کوئی اور وجہہ ہو ..... اسی لئے تو میں چاہتا ہوں، تم اس سے ملو ..... پوچھ کر دیکھو ..... شائد تمہیں وہ سب بتادے۔

نوجوان : نہیں پروفیسر صاحب ..... نہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں .... اور نہ کچھ پوچھنا۔

پروفیسر : میں تم دونوں کی گفتگو کتاب میں درج کرونگا۔ پڑھنے والوں کے لئے یہہ حصہ بہت دلچسپ ہوگا ـــــــ

نوجوان : (روکھی آواز میں) : ـــــــ پڑھنے والوں کیلئے۔

پروفیسر : (نوجوان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے) : کاش تم بھی .... اسے پڑھ سکتے!

نوجوان : (جیسے چونک کر) : پروفیسر۔ آپ ایسی باتیں مت کیجئے .... (اٹھکر کھڑا ہوجاتا ہے) .... کیا میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے؟ .... میرا مطلب ہے ....

پروفیسر : (اٹھکر، نوجوان کے کاندھے پر ہاتھ رکھکر) : ہاں۔ یہی کام تو تمہیں کرنا ہے ..... اچھا اب تم ذرا دیر کے لئے اس سامنے والے کمرے میں چلے جاؤ۔ میں اس لڑکی کو یہاں بلاتا ہوں۔

[رام داس دبے پاؤں کمرے میں آتا ہے۔ اور نوجوان کو مقابل کی دیوار کے دائیں

دروازے کی طرف لے جاتا ہے ۔ نوجوان کچھ توقف کے بعد چلا جاتا ہے ۔ رام داس دروازے ہی سے پلٹ آتا ہے ۔ پروفیسر کی طرف دیکھکر خاموشی سے نفی میں گردن ہلاتا ہے]

رام داس : ——— جی نہیں ۔ وہ آنے کو تیار نہیں ۔

پروفیسر : تم نے اسے سمجھایا ؟

رام داس : بہت سمجھایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بڑی ضدی لڑکی ہے ۔

پروفیسر : تم نے اس سے اس نوجوان کا ذکر تو نہیں کیا ؟

رام داس : نہیں جناب ۔ میں نے تو اس سے صرف یہہ کہا کہ پروفیسر صاحب نے بلایا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ذراسی دیر کے لیے ۔ مگر وہ نہیں مانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پروفیسر : (جیسے اپنے آپ سے) : مگر یہہ ٹھیک نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان دونوں کا ملنا بہت ضروری ہے رام داس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ۔ میں خود جاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ممکن ہے مان جائے ۔ ۔ ۔ ۔

[ساتھ ہی دائیں جانب کے اندرونی دروازے سے لڑکی کی آواز آتی ہے ——— "پروفیسر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پروفیسر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ساتھ ہی لڑکی تیزی سے داخل ہوتی ہے ۔ چہرے پر جھلاہٹ ہے]

لڑکی : اوہ ۔ آپ یہاں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر آپ مجھے اور کتنا ستائینگے ! بتلائیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری طبیعت بہت گھبرا رہی ہے ۔ دیکھئے بارہ بج چکے ہیں ۔ میں اب جاتی ہوں ۔

پروفیسر : تم نے وعدہ کیا تھا ایک بجے تک میری مہمان رہوگی ۔

لڑکی : لیکن میں نہیں سمجھتی، اب میرے یہاں رہنے سے آپکا کیا فائدہ ہے !

پروفیسر : بس سمجھ لو، یہہ میری خواہش ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (قریب آکر، نرم لہجے میں) ۔ بیٹی ۔ تم بہت سمجھدار ہو، مجھے یقین ہے، تم میری بات مان جاؤگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہو ٹھیر جاؤگی نا ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آؤ ۔ یہاں بیٹھ جاؤ (صوفے کی طرف اشارہ کرتا ہے) ۔

لڑکی : (ذرا سے تامل کے بعد بیٹھ جاتی ہے) : اچھی بات ہے ۔ میں ایک بجے تک اور ٹھیر جاتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پتہ نہیں میں آپ کی ہر بات کیوں مان لیتی ہوں !

پروفیسر : یو آر اے گڈ گرل ....

[رام داس دبے پاؤں کمرے سے چلا جاتا ہے۔ پروفیسر دیوار کے ساتھ رکھے بک شیلف کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے۔]

— — مجھے تم سے کچھ کہنا ہے .. .. بات یہہ دیکھو .... (پائپ اٹھا کر سلگانے لگتا ہے) .... بات یہہ دیکھو پل پر ایک نوجوان سے میری ملاقات ہو گئی - بڑا شریف اور نیک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ آنکھوں سے ذہانت بھی ٹپکتی ہے .... یہہ نوجوان بھی .... خودکشی کے ارادے سے آیا تھا ..... (لڑکی پلٹ کر اسے دیکھتی ہے) ..... اس وقت تک وہ موت کی ابدی نیند سو چکا ہوتا .... (لڑکی کے قریب آکر اسے گھورتے ہوئے) بڑی مشکل سے اسے یہاں لایا ہوں ..... ٹھیک ایک بجے وہ بھی دریا میں ڈوب جائے گا۔

لڑکی : وہ آدمی مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہے۔ میری طرح اتنے دن انتظار نہیں کریگا۔

پروفیسر : (لڑکی کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے) : مگر میں اسے یہاں لایا ہوں۔

لڑکی : لائے ہوں گے۔

پروفیسر : میں اسکو تم سے ملانا چاہتا ہوں۔

لڑکی : میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔

پروفیسر : بیٹی - تم نے اب تک میرا کہا مانا ..... کیا اتنی سی بات نہیں مانو گی ؟

لڑکی : پروفیسر - میں اب کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتی۔

پروفیسر : ٹھیک ہے - تم اپنا چہرہ چھپا کر بیٹھ سکتی ہو۔ (شال کو کاندھوں اور سر پر درست کر دیتا ہے)

لڑکی : لیکن میں کسی سے بات کرنا بھی نہیں چاہتی۔

پروفیسر : میں تم کو مجبور نہیں کرتا - یہہ تمہاری مرضی پر ہے۔

لڑکی : (عاجز ہو کر) : میں نے آپ سے زیادہ عجیب آدمی نہیں دیکھا پروفیسر

پروفیسر : وہ نوجوان اس کمرے میں بیٹھا ہے۔

لڑکی : آپ میرا تماشا بنانا چاہتے ہیں۔

پروفیسر : اسے یہاں بلالوں ..... یا تم وہاں چلوگی ؟

لڑکی : خدا معلوم کیوں میں آپ کیساتھ آ گئی تھی !

پروفیسر : میرے خیال میں ...... اسے یہاں بلالیا جائے ..... کیا کہتی ہو ؟

لڑکی : (جیسے چونک کر) : ...... جو آپ کا جی چاہے کیجئے ..... (گھڑی دیکھکر) اوہ ! ..... اب صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا ہے .....

پروفیسر : (پکارتا ہے) : نوجوان .... (دروازے کے قریب جاکر) تم اس کمرے میں چلے آؤ ۔

نوجوان : (آتے ہوئے) : میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا، آخر ... یہ سب کیوں ہو رہا ہے ! میں ...... میں کہتا ہوں آپ مجھے جانے کیوں نہیں دیتے ؟ ۔ (لڑکی کو دیکھکر ایک لمحہ کے لئے رکجاتا ہے) ..... پروفیسر ۔ آپ میری بات کیوں نہیں سنتے !

پروفیسر : (اسے پکڑ کر مقابل کے صوفے پر بٹھاتا ہے) : تم یہاں بیٹھ جاؤ ۔

نوجوان : لیکن ..... لیکن میں فوراً چلا جانا چاہتا ہوں ۔

پروفیسر : ضرور ...... ابھی چلے جانا ۔ اب صرف آدھے گھنٹے کی تو بات ہے ۔

نوجوان : (لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے) : مگر ... ، کیا ... ہم لوگوں کی ملاقات ....

پروفیسر : (بات کاٹ کر) : ہاں ۔ بہت ضروری ہے .... بہت ضروری ہے .... (دونوں ہاتھ مل کر) کہیں یہ قیمتی لمحات ضائع نہو جائیں ! ..... شائد پھر ایسا موقع کبھی نہ ملنے پائے ! ——— دو نوجوان ہستیاں، جو اپنی زندگی سے مایوس ہیں، جنہوں نے اپنے ارمانوں، اپنی امنگوں کا گلا گھونٹ دیا ہے، اپنا وجود اپنے ہی ہاتھوں سے مٹا دینا چاہتی ہیں ! ......

[پروفیسر اپنی دھن میں ٹہلتے ہوئے یہ مکالمات یوں ادا کر رہا ہے جیسے وہ کمرے میں تنہا ہو ———]

——— کون کس لئے مرنا چاہتا ہے، یہ مجھے نہیں معلوم ۔ مجھے اس سے کوئی سروکار بھی نہیں ۔ اہم بات یہ ہیکہ وہ مرنا چاہتا ہے ! اور ..... دو مرنے والوں کو

حالات نے یکجا اکٹھا کر دیا ہے۔ کیسا عجیب اتفاق ہے! ...... (دونوں ہاتھ ہلا کر) یہ تجربہ میری زندگی کا قیمتی سرمایہ بن سکتا ہے ..... (نوجوان اور لڑکی کو باری باری دیکھتا ہے) مجھے یقین ہے ... کہ تم دونوں میرے ساتھ تعاون کرو گے .... اچھا اب میں تم دونوں کو یہاں چھوڑ جاتا ہوں ..... (ایک دو قدم چل کر رکتا ہے) ... تم لوگوں کی زندگی میں اب صرف پچیس منٹ باقی ہیں ..... پچیس منٹ! ..... (پلٹ کر) اور پچیس منٹ کوئی زیادہ وقت نہیں ہوتا! (چلا جاتا ہے)

[نوجوان پروفیسر کی طرف دیکھتا رہتا ہے، جو دائیں دروازے سے اندر چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد چند لمحے اسی طرح کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔ پھر لڑکی کی طرف مڑ کر دیکھتا ہے۔ ہلکی سنگیت کا مدوجزر جاری رہتا ہے۔]

نوجوان : خوب! ...... گویا ہم انسان نہیں، اینٹ پتھر ہیں۔ ہمارے دل اور دماغ اس پروفیسر کے لئے تجربی آلات ہیں، جنھیں اس کے اشاروں پر کام کرنا ہے ...... ہمارے جذبات، ہمارے احساسات کی کوئی حقیقت نہیں، کوئی اہمیت نہیں ... (ٹہلتے ہوئے) عجیب دنیا ہے یہ بھی! جہاں چین سے موت بھی نصیب نہیں ...... یہاں کچھ بھی اپنا نہیں، نہ زندگی اپنی، ..... نہ موت اپنی! ...... ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے! (رک کر) اس پروفیسر کی خواہش ہے کہ ہم اپنی زندگی کے یہ آخری لمحات .... اس کے ..... مطالعے کی نذر کر دیں۔ مگر میں اس وقت ... کسی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا .... آپ سے بھی نہیں ... اور ... اور میں سمجھتا ہوں آپ بھی اس وقت اسی ذہنی مدوجزر سے گذر رہی ہوں گی جس سے میں گذر رہا ہوں .... آپ کی یہ خاموشی اسی بات کو ثابت کرتی ہے ..... میں ڈر رہا تھا کہیں آپ سے بے فائدہ، بے لطف اور رسمی بات چیت میں الجھنا پڑے گا ——— وہ بیوقوف پروفیسر سمجھ رہا ہوگا آپ اور میں ایک دوسرے سے مل کر، اپنی اپنی دکھوں کی کہانیاں سنا کر، مرنے کا خیال چھوڑ دیں گے۔

(طنزیہ ہنسی) ...... ہمارے پروفیسر اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتے ہیں ——

(دیوار کے پاس، بک شیلف کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے) اوہ! خدایا ...

یہ رات کب پورا ہوگا اور ...... اور میں موت کے آغوش میں آرام اور سکون سے سو سکوں گا! —— (رک کر، لڑکی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے) لیکن کہیں ...

ایسا تو نہیں کہ ...... پروفیسر ہمیں دھوکا دے رہا ہے؟ ...... کہیں ... کہیں اسنے پولس کو بلا لیا ہو تو ......!

لڑکی : نہیں۔

نوجوان : (جلدی سے) : آپ کو کیسے معلوم؟

لڑکی : پروفیسر نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔

نوجوان : اسکے وعدے کا کیا بھروسہ ——

لڑکی : مجھے آج یہاں تین دن ہو چکے ہیں ...... اگر وہ چاہتے تو ......

نوجوان : (قریب آتے ہوئے) : آپ کو پروفیسر پر بہت اعتبار ہے، ...... مجھے نہیں ہے۔ ...... میں سمجھتا ہوں، وہ یقیناً مجھے قانون کے حوالے کر دیگا ...... (بے چینی سے ٹہلنے لگتا ہے) اوہ! ...... مجھے اسکی باتوں میں نہیں آنا چاہیئے تھا ...... (ادھر اُدھر دیکھتا ہے) مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیئے ...... اب بھی وقت ہے ......

[کھڑکی کی طرف جاتا ہے۔ پھر بائیں جانب کے دروازے کو کھولنا چاہتا ہے جو بند ہے] —— اوہ ...... بند کر دیا ہے۔ میرا شبہ بڑھتا جا رہا ہے ...... میں سمجھتا ہوں مجھے یہ کھڑکی توڑ کر جانا پڑیگا ...... آواز ہونے کا خطرہ ضرور ہے، لیکن اور کوئی صورت نظر نہیں آتی ...... (کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے) یہاں سے دریا کا فاصلہ بھی بہت کم ہے ...... کہیئے آپ کا کیا ارادہ ہے؟ ...... آپ بھی چاہیں تو اس کھڑکی سے نکل کر جلد سے جلد اس پل پہ پہنچ سکتی ہیں ...

لڑکی : مجھے اسکی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی ——

نوجوان : (کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے) : کوئی سلاخ، کوئی لکڑی مل جائے تو

آسانی ہو گی۔

لڑکی : (اٹھکر، قریب جاتی ہے) : آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں! اس کھڑکی یا دروازے کو توڑنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑیگی .... پروفیسر نے کہا ہیکہ .....

نوجوان : (بگڑ کر) : پروفیسر! .... مجھے اسکی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں .... نہ میں یہاں اور ٹھیرنا چاہتا ہوں .... میں جلد سے جلد یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں، ...... سمجھیں؟

لڑکی : سمجھی ..... اور میں سمجھتی ہوں، آپ کا جلد چلا جانا ہی بہتر ہے۔

نوجوان : (حیرت سے، رک کر) : کیوں؟ ..... یہہ آپ کیوں کہہ رہی ہیں؟

لڑکی : اسلئے کہ وقت کیساتھ ساتھ آپ کی دماغی کشمکش میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے .... میں .... اس کشمکش سے اچھی طرح واقف ہوں ...... آپ بھاگ جائیے ..... اگر آپکا مرنا بہت ضروری ہے، تو آپ یہہ کھڑکی توڑ کر بھاگ جائیے .... اسلئے نہیں کہ یہاں پولیس آجائے گی، بلکہ اسلئے کہ ......

نوجوان : (چیخ کر، بات کاٹتے ہوئے) : میں اپنا ارادہ بدل دونگا! ..... آپ میرا مذاق اڑا رہی ہیں؟

لڑکی : نہیں ..... میں مذاق نہیں اڑا رہی ...... میں پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ سچ مچ اگر آپ کو خودکشی کرنی ہے تو آپ یہہ کھڑکی توڑ کر نکل جائیے ____

نوجوان : کیونکہ اگر اور تھوڑی دیر میں زندہ رہا تو ..... تو پھر مر نہ سکونگا۔

لڑکی : اسکا امکان ہے۔

نوجوان : (آہستہ سے) : اب میں سمجھ گیا، آپ یہہ سب کیوں کہہ رہی ہیں! ..... آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اب آپ مرنا نہیں چاہتیں .... تین دن بہت ہوتے ہیں!۔

لڑکی : (پرسکون انداز میں) : آپکا خیال غلط ہے۔

نوجوان : (اپنی دھن میں) : تبھی آپ میرے ساتھ نکل چلنے پر تیار نہیں ہیں۔ آپ

چاہتی ہیں کہ میں جلد سے جلد یہاں سے چلا جاؤں، .... یہہ کھڑکی توڑکر، ....
کیونکہ کہیں میری باتوں سے آپکے ذہن میں وہ جوالاَمکھی پھر سے زندہ نہہ ہو جائے جو سرد ہو چکا ہے۔

لڑکی : آپ اسطرح کی باتیں کرکے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں .... جس جوالاَمکھی کا آپ ذکر کر رہے ہیں، وہ میرے دل اور دماغ میں آگ لگاکر کبھی کا ختم ہو چکا ہے ...... اب اس جسم میں اس کی چھوڑی ہوئی راکھ کے سوا کچھ نہیں ہے ....
اور کیا آپ جانتے ہیں، میں نے خودکشی کا فیصلہ کب کیا ہے؟ ...... جب اس راکھ کی تہوں میں آخری چنگاری بھی دم توڑ چکی تھی .... میرا فیصلہ کسی دماغی انتشار کا نتیجہ نہیں ہے، ...... میں تو بہت سکون کے ساتھ سوچ سمجھکر، اس نتیجے پر پہنچی ہوں ....

نوجوان : لیکن کیا اب بھی آپکا وہی فیصلہ ہے؟

لڑکی : اسطرح کیا ہوا ارادہ، اتنی آسانی سے بدلا نہیں جا سکتا۔ اور پھر ..... اور پھر میں مرد نہیں ہوں!

نوجوان : ——— کیا مطلب!

لڑکی : کچھ نہیں ...... یہہ بات آپ نہیں سمجھ سکینگے۔ اور نہہ اس وقت میرا اشارہ آپکی طرف تھا ....

نوجوان : (آہستہ سے) : اوہ .... تو یہہ بات ہے ......

لڑکی : (چونک کر) : کیا بات ہے؟

نوجوان : ظاہر ہیکہ وہ .... وہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکا!

لڑکی : کون نہیں رہ سکا؟

نوجوان : جسکی خاطر آپ جان دے رہی ہیں ....

لڑکی : خیر ..... یہہ بات اب رہنے دیجئے۔ آپ نہیں سمجھ سکینگے، میں نے جان دیدینے کا فیصلہ کیوں کیا ہے .... آپ اپنی بات کہئے۔ آپ کو ڈر تھا ..... وہ .....

پروفیسر صاحب ......

نوجوان : پھر پروفیسر .... !

لڑکی : تو کیا اب وہ کھڑکی توڑ کر، آپ نے جانے کا ارادہ بدل دیا ہے ؟

نوجوان : اب میں اسطرح نہیں جاؤنگا .... آپ سمجھ رہی تھیں، میں اپنے آپ سے بچ کر، ڈر کر بھاگ جانا چاہتا تھا ...... !

لڑکی : لیکن اگر .... واقعی پروفیسر نے قانون کو یہاں بلالیا تو ..... ؟

نوجوان : تو کیا ؟ ...... کیا وہ مجھے اپنے ارادے سے ہمیشہ کے لیے باز رکھ سکتے ہیں ؟... ..... کیا ایک مرنے والے کے آگے یہہ باتیں، کوئی حقیقت رکھتی ہیں ! ....

[لڑکی صوفے پر بیٹھی رہتی ہے - نوجوان اسکے مقابل کھڑا ہوکر سگریٹ سلگاتا ہے]

..... لوگ کہتے ہیں کہ خودکشی ناسمجھ اور بزدل لوگوں کا کام ہے ...... ہوسکتا ہے کہ میں بزدل ہوں، ...... اور ناسمجھ بھی ...... لیکن .... لیکن آپ میں مجھے یہہ دونوں چیزیں بھی نظر نہیں آتیں ______

لڑکی : (بہت ہلکی سی مسکراہٹ) : پھر کیا نظر آتا ہے، آپ کو مجھ میں ______ ؟

نوجوان : (لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے) : آپ کی آنکھوں سے ذہانت اور چہرے سے حساس طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے ..... میں سوچ رہا ہوں ..... (رک جاتا ہے)

لڑکی : کیا سوچ رہے ہیں آپ ______ ؟

نوجوان : ...... میں سوچ رہا ہوں وہ کیسا آدمی ہوگا، جس نے آپ کے ساتھ بے وفائی کی !

لڑکی : یہہ آپ کیسے جان گئے کہ میں کسی کی بے وفائی کا شکار ہوئی ہوں ......

نوجوان : لڑکیاں جب خودکشی کرتی ہیں تو انمیں سے اکثر کی وجہہ یہی ہوتی ہے ..... اگر آپ کسی اور وجہہ سے جان دے رہی ہیں تو ...... تو واقعی آپ بہت عجیب ہیں ! .... آپ ...... آپ اسی شہر کی رہنے والی ہیں ؟

لڑکی : ہاں۔

نوجوان : تعجب ہے۔

لڑکی : تعجب کیوں ——— ؟

نوجوان : آپ تین دن سے گھر سے غائب ہیں اور .... ابھی تک کوئی آپکی تلاش میں یہاں تک نہیں آیا ——— !

لڑکی : (آہستہ سے) : میرا کوئی گھر نہیں ہے .... نہ کسی کو میری تلاش ہے ..

نوجوان : ماں باپ .... بھائی بہن ....

لڑکی : (بیچ کر) : نہیں .... میرا کوئی نہیں ہے ..... (رک کر) میں تنہا ہوں .... بالکل تنہا ... (اٹھکر کھڑکی کے پاس چلی جاتی ہے) لیکن آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں ؟ آپ نے کہا تھا آپ کوئی بات نہیں کرنا چاہتے ....

نوجوان : (ٹہلتے ہوئے) : آپ کی باتیں بڑی عجیب ہیں .... سمجھ میں نہیں آتا آپ جیسی لڑکی کو خودکشی کی ضرورت کیوں آن پڑی ! ....

لڑکی : (مسکراکر) : کہیں آپ یہ مت سمجھ لیجئے کہ میری دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے ۔

نوجوان : (پلٹ کر) : یہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں ۔ اور ...... اور اسی وجہ سے میرا تجسس بڑھتا جارہا ہے ...... (قریب آکر) آپ پڑھی لکھی ہیں، ذہین ہیں، عقل سلیم کی آپ میں کوئی کمی نظر نہیں آتی ...... پھر بھی جان دینے جا رہی ہیں ! تین دن سے وہ پروفیسر آپ سے پوچھ پوچھکر تھک گیا، مگر آپ نے اپنے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا .... آپ کون ہیں، کیا نام ہے، ..... کیوں مرنا چاہتی ہیں ! .... ظاہر ہیکہ میں بھی پوچھوں گا تو آپ کچھ نہیں بتائینگی ۔

لڑکی : اسکی ضرورت ہی کیا ہے ۔

نوجوان : ہاں ۔ ضرورت تو کچھ بھی نہیں ہے ..... اور نہ میں یہ سب آپ سے پوچھونگا ۔ ——— ابھی کچھ دیر بعد آپ اور میں اس دنیا کے جھگڑوں سے آزاد ہو جائینگے ....

لڑکی : (جیسے اپنے آپ سے) : لیکن کیا ..... یہ سچ ہے کہ موت سے آدمی ..... کی نجات ہو جاتی ہے .... !

نوجوان : اسی امید پر تو میں جان دینے جا رہا ہوں ۔ کل جب ..... میری لاش اس

دریا میں سے نکالی جائے گی تو ...... میں اس وقت تک ابدی نیند سو چکا ہونگا ...... لوگ اخباروں میں میری موت کی خبر پڑھینگے ...... اور ...... اور وہ بھی جس کی خاطر میں جان دے رہا ہوں ......

لڑکی : لیکن اخبار والوں کو پتہ کیسے چلے گا کہ آپ کون ہیں ؟

نوجوان : میں نے اپنے نام کا کارڈ حفاظت کے ساتھ جیب میں رکھ لیا ہے .... (جیب پر ہاتھ رکھتا ہے) ...... وہ پانی سے خراب نہیں ہوگا۔ لیکن ...... (مڑ کر دیکھتا ہے) آپ نے تو ایسا نہیں کیا ہوگا !

لڑکی : نہیں۔ کیونکہ میرا کوئی نام نہیں ہے۔

نوجوان : (قریب آکر) : .... یہ ناممکن ہے۔

لڑکی : ــــ آپ کو کتنا عجیب لگ رہا ہے ...... ہے نا؟ ...... (جاکر کھڑکی کے قریب کھڑی ہوجاتی ہے) .... چند لمحے خاموش رہ کر) ماں باپ نے میرا بھی ایک نام رکھا تھا ...... مگر اب وہ مجھے یاد نہیں رہا ...... اور اب جس نام سے لوگ مجھے پکارتے ہیں، وہ ...... وہ اخبار والے نہیں چھاپ سکینگے ...... (پلٹ کر، نوجوان کو دیکھتی ہے) جانتے ہیں میرا وہ نام کیا ہے .... منحوس !

نوجوان : منحوس !

لڑکی : (قریب آتی ہے) : ہاں۔ یہی میرا نام ہے .... میں جب سے پیدا ہوئی ہوں بدقسمتی اور نحوست نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میں جن لوگوں میں بھی رہی ہوں، جہاں بھی گئی ہوں دکھوں اور غموں کو بکھیرتی رہی ہوں ...... اور لوگوں نے مجھے منحوس کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ مجھے ...... ان سے کوئی شکائت بھی نہیں ہے۔ حالات اور میری قسمت ہی ایسی رہی ہیکہ اس دنیا میں مجھے غم کے سواء، کچھ نہیں مل سکا۔ اور ...... اور نہ میں کسی کو کچھ اور دے سکی ...... میں واقعی منحوس ہوں۔ جس کسی پر بھی میرا سایہ پڑا، یا تو وہ اس دنیا میں نہیں رہا، ...... یا پھر عمر بھر روتے رہنے کے لئے زندہ رہا ....

نوجوان : میں یہہ بات نہیں مان سکتا۔

لڑکی : اب یہی دیکھئے .... آپ سے میری ملاقات ہوئی‘...... اور ابھی کچھ دیر بعد آپ اس دنیا میں نہیں رہینگے ....

نوجوان : تو کیا آپ ...... محض اسی وجہہ سے خودکشی کر رہی ہیں ...... ؟

لڑکی : یہی سمجھ لیجئے۔ ساری تفصیل نہہ میں سنا سکوں گی اور ...... نہہ آپ سن سکینگے۔

نوجوان : (ٹہلتے ہوئے) : یہہ میں نہیں مانتا .... یہہ سب غلط ہے‘ بکواس ہے .... آپ محض اس وجہہ سے جان نہیں دے سکتیں! ...... یہہ ظلم ہے‘ ناانصافی ہے .... لوگوں کو کیا حق ہیکہ آپ کو اپنی بدقسمتی کا شکار بنائیں؟ آپ اس دنیا میں نہہ بھی آتیں تو ان کے ساتھ وہی ہوتا‘ جو ہوا ہے .... آپ جیسی سمجھدار لڑکی نے لوگوں کے دیئے ہوئے اس فیصلے کو کیسے تسلیم کرلیا کہ آپ منحوس ہیں‘ میری سمجھ میں نہیں آتا ______ !

لڑکی : آپ کی سمجھ میں آبھی نہیں سکتا۔ کیونکہ آپ کو پوری باتیں پوری کہانی نہیں معلوم ......

نوجوان : میں معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا .... ہوسکتا ہے کہ جس شخص کی خاطر آپ جان دے رہی ہیں‘ اسکی بے وفائی کو بھی آپ نے اپنی بدقسمتی جان کر چپ چاپ تسلیم کرلیا ہو! ...... آپ اپنے آپ پر ظلم کر رہی ہیں‘ خود کو دھوکا دے رہی ہیں‘ ...... میں ایسا نہیں ہونے دونگا۔

لڑکی : آپ کیا کر سکتے ہیں؟

نوجوان : میں آپ کو مرنے نہیں دونگا۔

لڑکی : آپ مجھے مرنے سے کیسے روک سکتے ہیں؟

نوجوان : روک سکتا ہوں .... میں آپ کو مرنے نہیں دونگا ....

لڑکی : (قریب آکر) : آپ خود ابھی تھوڑی دیر بعد .... موت کی آغوش میں چلے جائیں گے .... پھر بھلا مجھے مرنے سے کیسے روک سکتے ہیں! ..... یا پھر آپ نے اپنا ارادہ ترک کردیا ہے؟

نوجوان : (چیخ کر) : نہیں - میں اپنے ارادے پر اٹل ہوں ...... وہ نہیں بدل سکتا ....
آپ چاہیں تو میرے بعد اپنی جان دیدیں - لیکن میں اپنی زندگی میں آپ کو مرنے نہیں دونگا .... (بے چینی سے ٹہلتے ہوئے) آپ جیسی لڑکی کی زندگی یوں ضائع ہو جائے، یہہ میں جیتے جی برداشت نہیں کر سکتا .... آپ خود اپنے آپ سے واقف نہیں ہیں - آپ ...... آپ صحرا کے اس پھول کی مانند ہیں، جسکی کوئی قدر نہہ کر سکا !

لڑکی : اوہ - آپ نے شاعری شروع کر دی - پروفیسر نے کہا تھا کہ آپ شاعر ہیں، ... میں بھول ہی گئی تھی .... (رک کر) میں نے تو آپ کے بارے میں کچھ کبھی نہیں پوچھا!
...... اچھا ہی ہوا - ورنہ آپ کی کہانی سن کر مجھے بھی آپ سے ہمدردی ہو جاتی ....

نوجوان : (غصے سے) : ہمدردی ! .... مجھے اس لفظ سے چڑ ہے -

لڑکی : (دریچے کے قریب، ایک دم پلٹ کر) : میں سمجھتی ہوں اب وقت ہو گیا ہے .....
ہمیں مرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے -

نوجوان : سنئے - میرا آج رات مر جانا بہت ضروری ہے ..... لیکن آپ ایک دن اور ٹھیر جائیے
..... تین دن یوں بھی آپ انتظار کر چکی ہیں -

لڑکی : (زور سے) : نہیں - اب میں اور نہیں ٹھیر سکتی -

نوجوان : لیکن میں نہیں چاہتا کہ ....

لڑکی : (جلدی سے) : آپ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے .... ؟

نوجوان : (رک کر) : ٹھیک ہے - مجھے کوئی حق نہیں .... لیکن آپ نے یہہ بھی سوچا کہ کل جب ہماری لاشیں اس دریا سے ساتھ ساتھ نکلیں گی تو دنیا والے کیا سمجھیں گے ؟

لڑکی : مجھے اس کی کوئی فکر نہیں - آپ مرنے کے بعد بھی اس دنیا کا خیال کرنا چاہتے ہیں، جس نے آپ کی زندگی میں آپکا کوئی خیال نہیں کیا ! ...... [کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگتی ہے] ...... دیکھئے - چاند کی ہلکی ہلکی زرد روشنی میں دریا کا پانی چمک رہا ہے
...... ذرا اس پل کو دیکھئے .... جو ہمیں اپنے پاس بلا رہا ہے ......

نوجوان : (بے چین ہوکر) : نہیں - آپ ادھر مت دیکھئے .... وہ پل .... آپ وہاں نہیں جائینگی .... آپ نہیں جاسکتیں - وہ دریا، وہ خوفناک پل .... رات کا سناٹا ! نہیں نہیں ...... یہہ ناممکن ہے ......

لڑکی : کیا ناممکن ہے ؟

نوجوان : آپ وہاں نہیں جاسکتیں۔ میں آپ کو نہیں جانے دونگا ...... آپ زندہ رہنگی ....

لڑکی : (پلٹ کر آہستہ سے) : آپ کی باتیں، آپ کے خیالات سن کر میں بھی یہی سوچ رہی ہوں وہ کون بدنصیب ہے، جس نے آپ کو خودکشی پر مجبور کردیا ...... (رک کر) ..... خیر- چھوڑیئے ان باتوں کو ...... وقت ختم ہورہا ہے - اب ہمیں مرنے کی تیاری کرتی ہے ..... (بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہے) خدا جانے وہ پروفیسر صاحب کہاں چلے گئے ..... (پکارتی ہے) پروفیسر-

[پروفیسر دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے
باری باری نوجوان اور لڑکی کو دیکھتا ہے]

پروفیسر : میں تم دونوں کا ممنون ہوں کہ میری بات مان لی ..... ایک بجنے والا ہے ...... وعدے کے مطابق میں بھی اب تمہیں مرنے سے نہیں روکونگا ...... بشرطیکہ ..... تم اب بھی اپنے ارادے پر قائم ہو ...... (دونوں کو دیکھتا ہے) ہوسکتا ہے کہ تم نے اپنا ارادہ ملتوی ....

لڑکی : (بات کاٹ کر) : میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔

نوجوان : میں بھی زندہ رہنا نہیں چاہتا۔

پروفیسر : ٹھیک ہے - میں ایک پستول لایا ہوں [گون کی جیب میں سے پستول نکالتا ہے] ...... تم لوگ دریا میں ڈوب کر مرنا پسند کروگے ...... یا اس پستول سے ؟ .... میرے خیال میں پستول سے مرنا بہتر ہوگا - [ٹہلتا ہوا جاکر دیوار کی تصویر کے سامنے جاکھڑا ہوتا ہے] ...... میں تمہیں اچھی طرح دفن کردونگا بلکہ تمہاری قبروں پر موزوں کتبے بھی لگا دونگا ...... ورنہ ..... (پلٹ کر)

دریا میں تمہاری لاشیں مچھلیاں کھا جائینگی ...... یا شائد کوئی مگرمچھ نگل جائے!
...... اور پھر پانی میں ڈوب کر مرنے میں ...... تکلیف بھی زیادہ ہوگی ــــــ

لڑکی : (بے چین ہوکر) : پروفیسر۔ میں بہت جلد مرنا چاہتی ہوں۔

پروفیسر : (اس کی طرف مڑکر) : تم نے کون سی موت پسند کی ؟

لڑکی : اسی پستول سے ..... ابھی ...... اسی وقت۔

پروفیسر : اور تم ــــــ ؟ (نوجوان کی طرف دیکھتا ہے)

نوجوان : میں بھی پستول سے مرونگا۔ لیکن شرط یہہ ھیکہ پہلے میں ختم ہوں گا۔

لڑکی : نہیں۔ پہلے میں مروں گی۔ میں تین دن سے اس موت کا انتظار کر رہی ہوں۔

نوجوان : آپ میرے سامنے نہیں مرسکتیں ...... میں نے کہا تھا نا ...... میں ایک پھول کو اپنے سامنے مرجھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

لڑکی : (زور سے) : پروفیسر۔ یہہ ناممکن ہے ..... پہلے میں مروں گی۔

پروفیسر : اچھا ...... اچھا ... ٹھیرو۔ میں فیصلہ کئے دیتا ہوں۔ میں تم دونوں کے نام قرعہ ڈالتا ہوں ....

[پلٹ کر دائیں دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔ رام داس ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبہ لئے آتا ہے۔ پستول میز پر رکھکر، پروفیسر اسمیں سے دو چٹھیاں نکال کر دونوں کو بتاتا ہے ــــــ]

.... دیکھو۔ یہہ دو چٹھیاں ہیں۔ ایک پر شکاری لکھا ہے۔ اور دوسری پر شکار۔ جو شکاری بنے، وہ شکار پر گولی چلائے ...... تم دونوں کو یہہ شرط منظور ہے ؟

لڑکی : جی ہاں۔ منظور ہے ...... جلدی کیجئے۔

[پروفیسر دونوں چٹھیاں گول کرکے ڈبہ میں ڈال دیتا ہے]

پروفیسر : (لڑکی سے) : لو۔ اب تم انمیں سے ایک نکالو۔

لڑکی : (آگے بڑھکر ایک چٹھی نکالتی ہے) : یہہ لیجئے۔

پروفیسر : (کھول کر پڑھتا ہے) : یہہ تو شکار ہے۔ نوجوان ..... تم پستول اٹھاؤ اور اپنے شکار پر گولی چلاؤ ______

نوجوان : (پیچھے ہٹ کر) : نہیں پروفیسر۔ یہہ مجھ سے نہہ ہو سکے گا ..... میں ایک بے گناہ کو موت کا نشانہ نہیں بنا سکتا۔

پروفیسر : (لڑکی سے) : اچھا۔ تم کیا کہتی ہو ..... تم شکاری بنوگی ؟

لڑکی : (مضطربانہ) : جی ہاں۔ لائیے پستول ..... (جاکر میز پر سے پستول اٹھالیتی ہے)۔

پروفیسر : (ہاتھ سے روکتے ہوئے) : ٹھیرو بیٹی۔ تم شائد روشنی میں یہہ کام نہہ کرسکو .... (نوجوان سے) تم اس دیوار کیساتھ کھڑے ہو جاؤ [لیجا کر سامنے کی دیوار کیساتھ کھڑا کر دیتا ہے] ..... میں سوئچ دباتا ہوں ..... جب اندھیرا ہو جائے ..... اور تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ تو ....

نوجوان : (چیخ کر) : میں بالکل تیار ہوں پروفیسر۔

پروفیسر : ٹھیک ہے۔ یہی بات اندھیرا ہونے کے بعد کہنا ..... (پلٹ کر لڑکی سے) اور تم شکار کی آواز پر گولی چلا دینا ..... سمجھیں ؟ ..... (لڑکی کے قریب جاکر) ارے تم ..... تمہارے ہاتھ کانپ رہے ہیں !

لڑکی : میں بالکل ٹھیک ہوں۔

پروفیسر : اچھی بات ہے ..... لو میں سوئچ دباتا ہوں (جاکر سوئچ دباتا ہے۔ ساتھ ہی اسٹیج پر اندھیرا ہو جاتا ہے)

نوجوان : میں ..... میں بالکل تیار ہوں پروفیسر .....

[چند لمحے مکمل خاموشی رہتی ہے]

پروفیسر : بیٹی ..... تم بے ہوش تو نہیں ہو گئیں ؟

لڑکی : جی نہیں ..... میں ہوش میں ہوں .....

[ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز۔ جس کے ساتھ ہی لڑکی چیخ پڑتی ہے اور

نوجوان کے زمین پر گرنے کی آواز آتی ہے]

ی : .... پروفیسر، پروفیسر روشنی کیجئے (آواز سے سخت گھبراہٹ ظاہر ہوتی ہے)

میرا سر چکرا رہا ہے .... اوہ ! آپ ..... آپ کہاں ہیں پروفیسر؟

[روشنی ہو جاتی ہے۔ نوجوان فرش پر پڑا ہے۔ رام داس ایک شال لئے پاس

کھڑا ہے، اور آہستہ آہستہ شال سے نوجوان کو ڈھک دیتا ہے۔ پروفیسر خاموش

کھڑا رہتا ہے۔ لڑکی تیزی سے جاکر صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور دونوں ہاتھوں میں اپنا

چہرہ چھپا لیتی ہے۔ آواز میں دو ایک سسکیاں بھی شامل ہو جاتی ہیں ـــــ]

...... میرے خدا ...... یہ میں نے کیا کر دیا !

فیسر : (میز پر سے گلاس لے جاکر) : گھبراؤ مت بیٹی .... لو یہ پانی پی لو۔

ی : (پانی پی کر) : آپ .... آپ بہت ظالم ہیں، سنگ دل ہیں پروفیسر....

مجھ سے ایک بے گناہ کا خون کرا دیا ! ..... میں خونی ہوں .... !

فیسر : بالکل نہیں۔ تم نے اسکی مرضی سے گولی چلائی۔ اس غریب کی شکل آسان ....

ی : (زور سے) : نہیں ...... (اٹھکر کھڑی ہو جاتی ہے) وہ بہت نیک آدمی تھا۔

.... بے چارہ، بدنصیب ..... اسکی باتیں ..... اسکے خیالات ....

پروفیسر، وہ مجھے مار نہ سکا .... وہ مجھ پر گولی نہ چلا سکا ! اور میں .....؟ میں

کتنی ظالم ہوں .... اسے موت نے نہیں، میں نے مارا ہے ...... میں نے

مارا ہے اسے پروفیسر ! (ٹہلتے ہوئے، اک دم رک کر) کیا وہ مر گیا ؟ ......

کیا وہ مر چکا پروفیسر .... بولئے ۔ [پروفیسر چپ چاپ اسے گھورتا رہتا ہے]

...... آپ چپ کیوں ہیں ...... بولتے کیوں نہیں !

فیسر : (آہستہ سے) : ایک امید ہے اس کے بچنے کی ۔ اگر گولی اس کے دل یا دماغ پر نہیں

لگی ہے تو ....

کی : (بے چینی سے) : تو پھر دیکھئے نا ؟ .... خدا کیلئے جلدی کیجئے ۔

فیسر : ایسے نہیں ۔ تمہاری موجودگی میں، میں اسکا زخم نہیں دیکھ سکتا۔ تم سے ....

یہہ برداشت نہ ہوسکے گا ! تم ذرا اپنے کمرے میں جاکر بیٹھو ....

(رک کر) رام داس ....

لڑکی : اسے کسی طرح بچا لیجئے پروفیسر ———

[رام داس، لڑکی کو دائیں جانب کے دروازے سے اندر لے جاتا ہے
لڑکی جاتے جاتے، دو ایک بار رک کر نوجوان کی طرف دیکھتی ہے]

پروفیسر : (جاکر نوجوان کو ہاتھ سے جھنجھوڑتے ہوئے) : اٹھو .... اٹھو میرے دوست
.... آنکھیں کھولو ....

نوجوان : (کمزور سی آواز میں) : تم کون ہو ——— ؟

پروفیسر : کیا مجھے بھول گئے ؟

نوجوان : نہیں - میں تمہیں جانتا ہوں - تم قبر کے فرشتے ہو ...... میرا حساب لینے آئے ہو -

پروفیسر : تم مرے نہیں ہو نوجوان - زندہ ہو -

نوجوان : نہیں - میں مر چکا ہوں -

پروفیسر : نہیں میرے دوست ———

نوجوان : تو کیا یہہ قبر نہیں ہے ؟

پروفیسر : نہیں - یہہ تو میرا کمرہ ہے -

نوجوان : (شال کو ایک جھٹکے سے ہٹا دیتا ہے) : تو کیا میں زندہ ہوں ! (بیٹھ جاتا ہے)

پروفیسر : بالکل زندہ ! .... تمہارے کہیں گولی نہیں لگی -

نوجوان : تو وہ .... وہ پستول ...... ؟

پروفیسر : کارتوس خالی تھا - تمہیں صرف ذہنی صدمے نے بیہوش کر دیا تھا -

نوجوان : (سر کو تھامے ہوئے) : مگر ..... مگر میرا سر ! (اٹھکر کھڑا ہو جاتا ہے)
.... وہ لڑکی کہاں ہے ؟ کیا وہ ...... (پروفیسر کو گھورتے ہوئے)
..... کیا وہ مر گئی ——— ؟

پروفیسر : ——— زندہ ہے -

نوجوان : اوہ .... بشارت - مگر وہ ہے کہاں ؟

پروفیسر : اپنے کمرے میں - اب وہ نہیں مرے گی -

نوجوان . کیا اسے معلوم ہے کہ .... ؟

پروفیسر : (بات کاٹ کر) : نہیں - اسے کچھ نہیں معلوم - وہ سمجھے ہوئے ہے کہ تمہیں گولی لگی ہے ...... اور اب بہت پریشان ہے -

نوجوان : پریشان ——— !

پروفیسر : وہ چاہتی ہے کہ تمہیں کسی طرح بچا لیا جائے ......

نوجوان : (حیران سا) : بچا لیا جائے !

پروفیسر : (ٹہلتے ہوئے) : لڑکی کے دماغ نے حالات کے لحاظ سے جو ردعمل قبول کیا ہے، وہ میرے نظریئے کے عین مطابق ہے ...... اور میرے لئے بڑے اطمینان کا باعث ! ...... اب وہ تمہاری زندگی کے لیے بے چین ہے -

نوجوان : (چند لمحے خاموشی سے پروفیسر کو دیکھتا رہتا ہے) : پروفیسر ...... آپ کو اپنے نظریئے کی پڑی ہوئی ہے اور ...... اور ......

پروفیسر : (بات کاٹ کر، نوجوان کو گھورتے ہوئے) : سنو - ابھی میرے تجربے کی ایک کڑی باقی ہے - اب وہ لڑکی یہاں آئیگی ......

[دائیں جانب سے رام داس آتا ہے - اور پروفیسر کو سرخ رنگ میں بھیگی ہوئی ایک کپڑے کی پٹی دیکر واپس چلا جاتا ہے]

...... میں تمہارے بازو پر پٹی باندھے دیتا ہوں - یہ سرخ رنگ میں بھیگی ہوئی ہے - (نوجوان کے بازو پر پٹی باندھتے ہوئے) ...... تمہیں ایک زخمی کا رول ادا کرنا ہے - سمجھے ؟ ...... آؤ - اس طرف بیٹھ جاؤ .... بلکہ لیٹ جاؤ - [نوجوان کو ایک صوفے پر نیم دراز سا بیٹھا دیتا ہے] اب تم آنکھیں بند کرکے چپ چاپ پڑے رہو (پکارتا ہے) ——— رام داس - [دائیں جانب سے رام داس اور لڑکی آتے ہیں]

لڑکی : (مدہوشی میں) : کیا ہوا پروفیسر؟ کیا وہ ...... وہ گولی ......؟

پروفیسر : (لڑکی کو گھورتے ہوئے) : شکر ہے - وہ بچ گیا۔

لڑکی : بچ گیا؟ ——— اوہ - (آنکھیں بند کر کے ایک اطمینان کا سانس لیتی ہے)۔

پروفیسر : ہاں - گولی اس کے بازو پر لگی ہے ۔

[لڑکی نوجوان کے قریب جا کر رکجاتی ہے۔ ذرا سے توقف کے بعد جھک کر اسکے زخم پہ ہاتھ رکھتی ہے۔ جس کے ساتھ ہی نوجوان ظاہری درد سے کراہ اٹھتا ہے۔ آنکھیں بند کئے رہتا ہے —]

لڑکی : اوہ! - مجھے ...... میں بڑی شرمندہ ہوں ...... خدا کا شکر ہے کہ آپ بچ گئے ......

نوجوان : میں بھی یہ جان کر خوش ہوں کہ آپ زندہ ہیں ۔

پروفیسر : اور میں اس لئے خوش ہوں کہ تم دونوں خوش ہو ...... اور زندہ! .... تم دونوں نے موت کی سرحدوں کو چھوا ہے - اور دیکھا ہے کہ، زندگی اپنی تمام برائیوں، تمام مصیبتوں کے باوجود، اتنی بھیانک نہیں جتنی کہ ...... موت! [ٹہلتے ٹہلتے رک کر، نوجوان سے] اب تم اٹھکر کھڑے ہوجاؤ نوجوان ..... اور وہ پٹی اتار پھینکو ۔

[نوجوان اٹھکر، پٹی کھولتا ہے۔ لڑکی حیران سی دیکھتی رہتی ہے]

لڑکی : ——— مگر کیا ...... کیا وہ گولی ......؟

پروفیسر : ——— ساری باتیں آہستہ آہستہ تمہاری سمجھ میں آجائینگی بیٹی ......
اب تم دونوں، ادھر دالان میں بیٹھکر باتیں کرو - رام داس نے تمہارے لئے گرم گرم کافی بنوائی ہے ...... میں بھی ابھی دو ایک منٹ میں آکر تمہارے ساتھ کافی پیونگا ...... مجھے ایک ضروری نوٹ لکھنا ہے ......
اس کے بارے میں کل صبح تم سے باتیں ہوں گی ...... اب جاؤ ......

[لڑکی اور نوجوان چند لمحے خاموشی سے پروفیسر کو گھورتے رہتے ہیں ۔

پھر آہستہ آہستہ دائیں دروازے سے اندر چلے جاتے ہیں۔ پروفیسر
انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر پلٹ کر رام داس کی طرف دیکھتا ہے]

رام داس : آپ نے اپنی کتاب کے چوتھے CHAPTER میں اسی SITUATION کا ذکر کیا ہے۔

پروفیسر : (ٹہلتا ہوا) : ہاں ..... میں نے تم سے کہا تھا نا ...... موت کا تصور، مرنے والوں کے ذہن میں خواہ کتنا ہی خوبصورت، کتنا ہی حسین کیوں نہو، موت کی ایک جھلک، اس سارے حسن کو برف کی طرح پگھلا دیتی ہے .... تمہیں یاد ہے، وہ کیس ......؟ (سوچنے لگتا ہے)

رام داس : کیس نمبر (14) ——

پروفیسر : ہاں ۔ وہی ..... اس کیساتھ اب اس آج کے تجربے کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے .... ذرا میز پر سے —— میرا فائل تو دینا ——

[رام داس دائیں دیوار کے ساتھ والی میز پر جاکر کاغذات
الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے ۔ پروفیسر کسی گہری سوچ میں
ٹہلتے ہوئے پائپ سلگاتا ہے ——
—— آہستہ آہستہ پردہ گرجاتا ہے]